مذہب وتمدّن

اس میں بتایا گیا ہے کہ کائنات، خالقِ کائنات اور مقصدِ حیات
کے بارے میں صحیح عقیدہ اور صحیح علم ہی پر ایک استوار معاشرہ اور
صالح تہذیب و تمدّن کی عمارت قائم ہوتی ہے دنیا ابتک جن تہذیبی ادوار
سے گزر چکی ہے وہ کن عقائد و نظریات کی پیداوار تھیں اور اسلام سے کسطرح
ایک صالح اور صحت مند تمدّن کا وجود ہوتا ہے؟

از

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام

ادارہ طباعت

۱، کے۔۳، ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۱، کراچی ۷۴۶۰۰

مذہب وتمدن

اس میں بتایا گیا ہے کہ کائنات، خالق کائنات اور مقصدِ حیات کے بارے میں صحیح عقیدہ اور صحیح علم ہی پر ایک استوار معاشرہ اور صالح تہذیب و تمدن کی عمارت قائم ہوتی ہے دنیا اب تک جن تہذیبی ادوار سے گزر چکی ہے وہ کن عقائد و نظریات کی پیداوار تھیں اور اسلام سے کس طرح ایک صالح اور صحت مند تمدن کا وجود ہوتا ہے؟

از

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجلس نشریات اسلام
۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن - ناظم آباد نمبر ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اپنی حیات میں درج ذیل اداروں کے ذمہ دار رہے

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
- صدر مجلس انتظامی ومجلس عاملہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
- صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی ومدینہ یونیورسٹی
- صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ۔

نام کتاب	مذہب وتمدن
تصنیف	مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
طباعت	مولائی پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت	۱۱۲ صفحات

ٹیلیفون : 6601817

اسٹاکسٹ: مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر۔ اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام ۱۔کے۔۲ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

مذہب و تمدن

عربی .. .. بیروت

انگریزی .. .. لکھنؤ

اردو .. .. لکھنؤ و کراچی

فہرست عناوین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ الْمُرْسَلِیْنَ

سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۔

پیش نظر مقالہ ایک علمی مضمون ہے، جو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تحریک و فرمائش پر لکھا گیا، اور ۱۹۴۲ء میں ایک منتخب علمی مجلس میں جس میں جامعہ کے فاضل اساتذہ، طلبہ اور دہلی کے اہل علم و اہل ذوق شریک تھے، پڑھا گیا اور پسند کیا گیا۔[1] ۱۹۴۳ء میں مکتبہ جامعہ ملیہ کی طرف سے "مذہب و تمدن" کے نام سے یہ رسالہ شائع ہوا، اس کا ایک ایڈیشن پاکستان سے بھی نکلا، اور جلد نایاب ہو گیا، موضوع چونکہ اب بھی نافع ہے، اور جس نقطۂ نظر اور اسلوب سے اس اہم مضمون میں مذہب و زندگی دونوں کے بنیادی مسئلہ پر بحث کی گئی ہے، وہ اب بھی وقیع ہے، اس لئے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی جانب سے مصنف کی مزید تنقیح و نظر ثانی کے بعد اس کو ــــــ شائع کیا جا رہا ہے، امید ہے کہ وہ اپنے محکم علمی استدلال، بحث کی سنجیدگی و گہرائی، تاریخ و فلسفہ کے وسیع و عمیق مطالعہ اور تحریر کی شگفتگی اور دل آویزی کی وجہ سے اس نئے علمی طبقہ میں دلچسپی سے پڑھا جائے گا جو مذہب اور زندگی کے متعلق سعی و جستجو رکھتا ہے، اور سنجیدگی کے ساتھ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ مذہب زندگی کی کیا رہنمائی کرتا ہے، اور تمدن و معاشرے کو کیا بنیادیں اور

[1] اس وقت صاحب مقالہ کی عمر ۲۸ سال تھی، اس نے عمر کی اس کمی کو مطالعہ، محنت سے پورا کرنے کی کوشش [illegible]

کیا رہنما اصول عطا کرتا ہے، اور کس انداز و مزاج کی زندگی اور سوسائٹی وجود میں لاتا ہے، اور اس کے بغیر زندگی اور تمدن کو کیا خطرات در پیش ہیں؟ امید ہے کہ اس مختصر سے رسالہ میں جو ایک توسیعی خطبہ کی حیثیت رکھتا ہے، اہل نظر کو بعض ایسے حقائق اور اشارے ملیں گے، جو مذہب و تمدن کی بہت سی ضخیم کتابوں میں آسانی سے نہیں ملتے، اور اس لئے اس موضوع پر غور و فکر کرنے والوں، لکھنے اور گفتگو کرنے والوں کو صالح ذہنی غذا اور صحیح رہنمائی حاصل ہوگی، اور اہل یقین کے یقین میں اس سے اضافہ ہوگا، اور یہی "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کا بنیادی مقصد ہے۔

ناشر

سکریٹری مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۱۰/۴/۱۳۹۹ھ
۹/۳/۱۹۷۹ء

مذہب، فلسفہ اور تمدن
کے
مشترک سوالات

مذہب، فلسفہ اور تمدن کے چند مشترک سوالات ہیں، جن کے جواب ہی پر ان سب کی بنیاد ہے، اس دنیا کا آغاز و انجام کیا ہے، کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے، اگر ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے، اور اس کے لئے اس زندگی میں کیا ہدایات ہیں۔؟

نیز یہ کہ کائنات بحیثیت مجموعی کیا ہے، اس کو اس نظم و ضبط میں رکھنے والی اور ایک ہمہ گیر اور محکم قانون کے مطابق چلانے والی ذات کون سی ہے، اس کے کیا صفات ہیں، اس کا انسانوں سے کیا تعلق ہے، اور انسانوں کا اس سے کیا تعلق ہونا چاہیے، کیا ان قوانین طبعی کے علاوہ جو اس عالم میں کار فرما ہیں، کوئی اخلاقی قانون بھی ہے، اگر ہے تو اس کی کیا تفصیلات ہیں، انسان کی اس کائنات میں صحیح حیثیت اور منصب کیا ہے، وہ خود مختار ہے یا کسی کا ماتحت، کسی دوسری طاقت اور عدالت کے سامنے ذمہ دار ہے یا آزاد اور غیر ذمہ دار، اس کا کمال مطلوب کیا ہے؟

یہ اولین اور بنیادی سوالات ہیں، جن کو کوئی ایسا نظام ایک لمحہ کے لئے بھی نظر انداز

نہیں کر سکتا جس کا تعلق زندگی کی گہرائیوں سے ہو، اور جس کی جڑیں انسان کے قلب و دماغ میں پیوست ہوں، اور اس کی شاخیں انسانی زندگی کی وسعتوں پر پھیلی ہوئی ہوں مذہب انہی سوالات کا یقینی جواب دینے کا دعویٰ کرتا ہے، فلسفہ انہی مسائل سے بحث کرتا ہے، تمدن (اپنے وسیع اور عمیق مفہوم میں) انہی بنیادوں پر اپنی عمارت قائم کرتا ہے۔

ان سوالات کا متعین جواب دیئے بغیر نہ ہم زندگی کا کوئی حقیقی مسئلہ طے کر سکتے ہیں، نہ تمدن واجتماع کا کوئی نقشہ بنا سکتے ہیں، کوئی تمدن خواہ کتنا سطحی اور مادی ہو، ان سوالات کے جواب کا کوئی نہ کوئی رخ ضرور رکھتا ہے، جو اس کی عمارت کی بنیاد کے نیچے بھی بنیاد کا کام دیتا ہے، اور بنیاد کی اس گہرائی سے لے کر اس کے کاخ و ایوان کی بلندی تک یکساں اثر انداز ہوتا ہے، اسی ذہنی سرچشمہ سے اس کی زندگی کی ساری نہریں پھوٹتی ہیں، اور ان کے رخ متعین ہوتے ہیں، معاشرت و معاملات اخلاق و اجتماع، سیاست و آئین، علم و فلسفہ، تہذیب و شائستگی غرض اندرونی و بیرونی زندگی کے تمام مناظر و مظاہر اسی بنیادی تصور کا عکس ہوتے ہیں، اگر آپ کو معلوم ہے کہ کسی قوم یا تمدن نے مندرجہ بالا سوالات کے جواب کا فلاں پہلو اختیار کیا ہے تو آپ اس کی زندگی کے نقشہ کے تمام خانے ازخود بھر سکتے ہیں، یا اگر آپ کی کسی قسم کی زندگی اور کسی تمدن کی خصوصیات پر گہری نظر ہے، تو آپ صحیح طور پر تشخیص کر سکتے ہیں کہ اس نے جواب کا کون سا پہلو اختیار کیا ہے۔

یہ سوالات انسان کی فطرت کے سوالات ہیں، اس لئے انسان کی فطرت کی طرح ان کی تاریخ بھی قدیم ہے، دنیا کے ہر دور میں یہ سوالات پیدا ہوئے،

اور ان کا جواب دیا گیا اور انہی جوابات پر مختلف انسانی فلسفے، تہذیبیں، اور نظام حیات قائم ہوئے، جن کی تاریخیں ہم پڑھتے ہیں، اور اکثر ان کی بالائی سطح اور اس کے ظاہری نقش و نگار سے اس کی فرصت نہیں ہوتی کہ ہم ان کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ کریں اور ان کا وہ مزاج معلوم کریں، جس کی وجہ سے وہ دوسرے تمدنوں سے ممتاز ہیں۔

ہم کو اس موقع پر یہ دیکھنا ہے کہ ان سوالات کے حل کے ہمارے پاس کیا ذرائع ہیں، اور ان سوالات کو کس کس طرح حل کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں ہم کو سب سے پہلے اپنی قوتوں کا جائزہ لینا ہوگا، جن سے ان سوالات کے جواب میں ہم بظاہر مدد لے سکتے ہیں۔
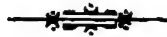
جواب کے وسائل اور ان کی علمی تنقید

حواس

علم حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس قدرت کا سب سے بڑا اور عام عطیہ یہ حواس خمسہ ہیں، جن کے ذریعہ ہم یقینی علم حاصل کر سکتے ہیں، بہت سے حکماء حواس کو حصولِ علم کا ایک مشتبہ ناقابل اعتماد اور کمزور ذریعہ مانتے ہیں، سترھویں صدی کا ایک عالم نکولاس میلیبرانش (NICOLAS MALEBRANCHE) (م ۱۷۱۵ء) اپنی کتاب "جستجوئے صداقت" (RECHERCHE DE LA VERITE) میں لکھتا ہے:۔

"غلطی کا ایک بڑا ماخذ یہ غلط یقین ہے کہ حواس جو حقیقت میں ہم کو محض عملی اغراض کے لئے عطا ہوئے ہیں، ماہیت اشیا کو ہم پر منکشف کر سکتے ہیں۔"

مونٹین (MICHEL DE MONTAIGNE) (م ۱۵۹۲ء) لکھتا ہے:۔

"انسان کا علم بہت ناقص ہے، اس کے حواس غیر یقینی اور خطاپذیر ہیں، ہم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے حقیقت کو ہمارے سامنے پیش کیا حواس کو دنیا ایسی ہی معلوم ہوتی ہے، جیسی ان کی فطرت و حالت ہے،

ادراکِ حسّی میں خارجی اشیا نہیں، بلکہ محض آلات جس کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے، حواس پر یقین کرنے کے لئے ہمارے پاس ایک آلہ ہونا چاہیئے جو ان کی تصدیق و تکذیب کر سکے اور پھر اس آلہ کی جانچ کے لئے ایک اور آلہ ہونا چاہیئے، اسی طرح یہ سلسلہ غیر تناہی ہوگا۔"[1]

پھر بھی چونکہ محسوسات سے زیادہ بدیہی اور قطعی معلومات ہم کو میسر نہیں آسکتے ہم نے انہی حواس کے ذریعہ اس عالم کو دریافت کیا، اور اس سے تعلق پیدا کیا ہے، اس کے بہت سے طبعی قوانین اور ظواہر معلوم کئے ہیں' ہمارے پاس مناظر و مرئیات' مسموعات اور دوسرے محسوسات کا ایک بڑا خزانہ ہے' اس لئے ہم کو مندرجہ بالا سوالات پر پھر ایک بار نظر ڈالنی چاہیئے، اور ایک ایک سوال کو اپنے حواس کی قوت سے حل کرنا چاہیئے۔!

لیکن کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ پہلے ہی سوال کو لیجئے، ہم کہاں سے آئے اور کہاں جائیں گے؟ یعنی اس عالم کا آغاز و انجام کیا ہے؟ کیا ہماری آنکھیں، ہمارے کان' ہماری قوتِ لامسہ' ہماری قوت ذائقہ اور قوت شامّہ اپنی صحت اور طاقت کے باوجود اس بارے میں ہماری کوئی رہنمائی کر سکتی ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم حواس کے ذریعہ صرف اتنا ہی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم اس وقت کہاں ہیں' ہماری یہ تمام طاقتیں اس کے آگے اور پیچھے ایک خاص حد پر جا کر ٹھہر جاتی ہیں' اور ان سرحدوں کو پار نہیں کر سکتیں، جو فطرت نے قائم کر دی ہیں، ہم ایک خاص حد کے آگے دیکھ نہیں سکتے،

---

[1] A HISTORY OF MODERN PHILOSOPHY, VOL. I,

DR. HEROLD HOFFDRING. LONDON (1924) PP 248, 28)

ایک حد تک ہماری قوت سماعت کام کرتی ہے' دوسرے حواس کی طاقتیں ان دو سے بھی زیادہ محدود ہیں' اس زندگی کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں؟ ہمارے حواس نہ اس کا اثبات میں جواب دے سکتے ہیں نہ نفی میں' اس لئے کہ یہ حواس خود اس زندگی کے پابند اور اس کی حد کے اندر محدود ہیں' اس کے باہر کسی چیز پر وہ کوئی موافق یا مخالف حکم نہیں لگا سکتے، اور اس کی ان سے نہ تصدیق ہو سکتی ہے' نہ تکذیب' ان کی بنا پر زیادہ سے زیادہ اس کے محسوس ہونے کا انکار کیا جا سکتا ہے، موجود ہونے کا انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن کیا محسوس اور موجود ایک چیز ہے؟ اور جو محسوس نہیں وہ موجود ہی نہیں' کیا روزمرہ کی زندگی میں ہمارا اسی پر عمل ہے' جس کو ہم محسوس نہیں کرتے اس کو موجود بھی نہیں مانتے' یقیناً نہیں' اگر ایسا ہو تو انسان اور جانوروں میں کوئی فرق نہ رہے اور علم و تمدن کی ساری عمارت منہدم ہو جائے!!

بس جب اس زندگی کا ہم اپنے حواس کے ذریعہ سرے سے ادراک ہی نہیں کر سکتے تو اس کی مزید تفصیلات و کیفیات کا علم کیا حاصل کر سکتے ہیں۔

اسی طرح یہ سوال کہ یہ عالم بحیثیت مجموعی کیا ہے' حواس کے لئے ناقابل حل ہے' حواس اس عالم کے کسور و اجزا کو معلوم کر سکتے ہیں' اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عالم کے صدہا کسور و اجزا حواس کے تحت میں آ سکتے ہیں' اور ہم اپنے حواس سے ان کو محسوس کرتے رہتے ہیں' لیکن کیا ہمارے حواس ہم پر ان منتشر اجزا کے باہمی ربط کو بھی منکشف کر سکتے ہیں' جو ان کو مربوط کر کے ایک متناسب و متوازن مجموعہ کائنات بنائے ہوئے ہے' اور پھر اس ربط و ہم آہنگی کا حقیقی سبب اور اس عالم کا مرکز اصلی بھی دریافت کر سکتے ہیں' جہاں سے اس کو زندگی' طاقت' روشنی' متضاد عناصر میں اجتماع' اور منتشر اجزا میں ضبط و نظام حاصل

ہوتا ہے، اسی طرح ہم اپنے حواس کے ذریعہ صرف قوانین طبعی کا تھوڑا بہت علم حاصل کرسکتے ہیں، اس لئے کہ ان کے بہت سے آثار و نتائج ہمارے مشاہدہ اور حس میں آتے رہتے ہیں، اور ان میں سے بہت سی چیزیں ہمارے لئے بدیہی ہیں، آگ کے متعلق ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ وہ جلاتی ہے، پانی کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وہ پیاس بجھاتا ہے، زہر کے متعلق ہمارا مشاہدہ ہے کہ وہ قاتل ہے لیکن اخلاقیات کے متعلق ہمارا یہ مشاہدہ اور تجربہ نہیں ہم جس طرح اپنی قوت لامسہ سے آگ کی تپش معلوم کرلیتے ہیں، اور اس کے جلانے کی طاقت کو اپنے حواس سے جانتے ہیں، اسی طرح ظلم کے نقصان اور اس کی خرابی کو اپنے ظاہری حواس سے نہیں معلوم کرسکتے، جھوٹ اور خیانت اور دوسرے اخلاقی جرائم کے قبح کا ہم محض حواس سے ادراک نہیں کرسکتے، اس کے لئے ایک اخلاقی وجدان یا مذہبی ایمان کی ضرورت ہوگی، اس سے ہم کو جو قلبی احساس حاصل ہوگا، وہ آگ کی تپش یا ہاتھ کی سوزش سے مختلف ہوگا۔

اسی طرح انسان کے متعلق جہاں تک ہمارے حواس ظاہری کا تعلق ہے، ہم یہی محسوس کرسکتے ہیں کہ وہ آزاد و خود مختار ہے، وہ کسی غیر انسانی عدالت یا حکومت کے سامنے جواب دہ اور ذمہ دار نظر نہیں آتا، اس میں اور دوسرے جانوروں میں اس کے سوا اور کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ایک بولنے والا جانور (حیوانِ ناطق) ہے، اور ایک ترقی یافتہ قسم کا چرند ہے، اس کا کمال مطلوب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے حیوانی تقاضوں کو اپنی انسانی ہنرمندی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پورا کرے۔

یہ ہمارے حواس ظاہری کا طبعی عمل اور اس کے طبعی نتائج ہیں، ابھی میں یہ عرض

نہیں کروں گا کہ ان حواس پر اعتماد کر کے اگر ہم محسوسات ہی پر اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کریں تو وہ عمارت کیسی ہوگی، اور اس کی بنیادیں کون سی خرابیاں ہوں گی، اور اس کی دیواروں میں کہاں تک کجی ہوگی۔

عقل

جانوروں کے مقابلہ میں انسان کا جو کچھ امتیاز ہے، وہ عقل کی وجہ سے ہے، یہ مسائل تمام تر انسان کے تھے، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کیا عقلِ انسانی سے انسانی زندگی اور کائنات کے اس معمے کو حل کر سکتے ہیں۔

عقل کا خود عقل پر جو کچھ رعب ہے، اس سے آزاد ہو کر اگر ہم عقل کی عقلی تنقید یں کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ عقل اپنا طبعی فریضہ انجام دینے میں تنہا کافی نہیں، اس کو اپنے علاوہ اپنے سے کمتر چیزوں سے مدد لینی پڑتی ہے، کسی ایسی چیز تک پہنچنے میں، جس کو وہ ابھی تک نہیں جانتی، ان معلومات سے کام لینا پڑتا ہے، جو اس کو پہلے سے حاصل ہوتے ہیں، یہ مقدمات محسوسات ہی ہوتے ہیں، تمام معقولات کی تحلیل و تجزیہ کیجئے گا، اور عقل کا دلچسپ اور طویل سفر نامہ سنئے گا تو معلوم ہوگا کہ حقائق کی ان نئی نئی دنیاؤں تک پہنچنے اور لاعلمی کے ان بڑے بڑے سمندروں کے عبور کرنے میں اس کا ذریعۂ سفر وہی حقیر محسوسات اور ابتدائی معلومات تھے، جو بلا کسی عقلی ترتیب کے اس عظیم الشان نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔

پس جہاں انسان کے حواس کام نہ کر سکتے ہوں، جہاں اس کے پاس معلومات کا کوئی ذخیرہ نہ ہو، جس کے مبادی سے بھی وہ خالی الذہن ہو، وہاں اس کی عقل اسی طرح

بے بس ہوتی ہے، جس طرح انسان کشتی کے بغیر سمندر کو عبور نہیں کر سکتا، اور طیارہ کے بغیر ہوا میں اڑ نہیں سکتا۔

آپ اس کا تجربہ کر سکتے ہیں، ایک ذہین آدمی جو ریاضی کے ابتدائی اصول سے واقف نہ ہو، اعداد تک اس کو معلوم نہ ہوں، وہ فطرتاً خواہ کتنا ہی ذکی ہو، ریاضی کا کوئی پیچیدہ سوال حل نہیں کر سکتا کوئی غیر معمولی ذہین انسان اقلیدس کے اصول موضوعہ کی واقفیت کے بغیر کوئی شکل ثابت نہیں کر سکتا، جس شخص نے کسی زبان کے حروف ہجی (ALPHABET) نہیں سیکھے، وہ ہزار عقل و قیاس سے کام لے اس زبان کی ایک سطر نہیں پڑھ سکتا جس شخص کو کسی زبان کے مفردات بھی معلوم نہیں، وہ اس زبان کی کوئی عبارت محض اپنی ذہانت عام یا قیاس سے نہیں سمجھ سکتا، اسی طرح ہر فن اور علم کے مبادی قیاس کر لیجئے۔

اب مندرجہ بالا سوالات کو لیجئے، ان تمام سوالات کا تعلق تمام تر مابعد الطبیعیات سے ہے، عالم کے آغاز و انجام، زندگی بعد موت مجموعۂ کائنات خالق و مدبر کائنات، اس کی ذات و صفات، اس کی منشاء تخلیق، قوانین اخلاقی، منصب انسانی، ان میں سے کون سی ایسی چیز ہے، جس کے متعلق ہم کچھ بھی معلومات اور تجربہ رکھتے ہیں، یا جن کے علم کے مبادی بھی ہم کو حاصل ہیں یا حاصل ہو سکتے ہیں، ان تمام مسائل میں حواس کی طرح عقل کی بھی معقول پوزیشن یہ ہے کہ وہ ایک غیر جانبدار فریق کی طرح سکوت اختیار کرے، اس کو نہ اس کی طاقت ہے کہ وہ محض اپنے زور پر ان مسائل کو ثابت کرے یا ان کی تشریح کرے، نہ قانوناً اس کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی نارسائی کی بنا پر ان کا انکار کر دے، جس طرح ایک نابینا کو اس کا حق نہیں کہ ایک بینا کے مشاہدات و

تجربات کی اپنے نہ دیکھنے کی بنا پر تردید کرنے لگے، وہ زیادہ سے زیادہ اپنے مشاہدہ اور رویت کی نفی کرسکتا ہے، مزید برآں اس کو یہ بھی حق نہیں کہ وہ اس کے چشم دید بیانات کی تشریح و تفصیل کرنے لگے، اس لئے کہ اس کے لئے اس کا بھی کوئی امکان نہیں۔

لیکن انسان کی فطرت غیر قانع اور متجسس واقع ہوئی ہے، کچھ اپنے اس فطری تجسس کی بنا پر اور زیادہ تر مدعیانِ عقل کی خود فریبی کی وجہ سے اس نے ان مسائل میں جستجو شروع کی، اور اپنے عقل و فہم اور ظن و قیاس سے ان کے جوابات دیئے، ان کی تفصیلات طے کیں، ان قیاس آرائیوں اور موشگافیوں کا نام فلسفہ ہے۔

فلسفہ

ایک سلیم الفطرت طالب علم کے لئے علوم انسانی کی پوری تاریخ میں کوئی علمی انکشاف غالباً اس درجہ حیرت انگیز نہ ہوگا، جتنا یہ انکشاف، کہ تقریباً ڈھائی ہزار[1] سال تک متواتر فلسفہ جیسے علم نے جس کو مبنی بر عقل و استدلال ہونے کا دعویٰ ہے، اور جس کی بنیاد اصولِ منطق پر ہے، ایسے مسائل سے بحث جاری رکھی جس کے مبادی اولیہ بھی اس کو حاصل نہ تھے، اور نوع انسانی کے لائق ترین افراد اس طویل مدت تک ایسی منزل کے پیچھے سرگرداں رہے، جس کا نشانِ راہ بھی ان کو حاصل نہ تھا، خدا کی ذات اور اس کی ماہیت، خدا کی صفات اور ان کی حقیقت ان کا ذات سے تعلق اور نسبت، ان صفات کا طریقِ ظہور، افعالِ خداوندی کا

---

[1] سقراط کا سن وفات ۳۹۹ ق.م. ہے اور فلسفہ کا وجود اس سے قبل ہو چکا تھا۔

صدور اور ان کی کیفیت، عالم کا حدوث وقدم، حیات بعد الموت اور دوسرے الٰہیاتی اور مابعد الطبیعی مسائل کے بارہ میں انھوں نے اس وثوق و تحکم اس تفصیل و تدقیق سے بحث کی، جو صرف ماہر کیمیا، اپنے کیمیاوی تجربوں اور تحلیل و تجزیہ کے بعد کر سکتا ہے۔

ا بھی کچھ تعجب خیز نہیں کہ فلسفہ کی اس طویل زندگی میں ہر قسم کی آزادانہ تنقید کے ... کم لوگوں نے اس غلط روی کا احساس کیا، اور ان کو اس اصولی غلطی کا تنبہ ہوا، اسی طرح فلسفہ کے اس عظیم الشان کتب خانہ میں شاذ و نادر ایسے فلاسفہ کے نام ملتے ہیں، جنھوں نے اس طریق کار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اور اگر صدیوں میں چند اشخاص نے یہ آواز بلند بھی کی تو اس نقار خانہ میں یہ صدائے طوطی ... نہیں گئی، او ... س سے فلسفہ کے اس مشغلۂ بادپیمائی میں کوئی فرق واقع نہ ہوا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ عقل کے حدود سے بخوبی واقف ہیں، اور فلسفہ کی اسی بے بسی نے ان کو تصوف اور مشاہدۂ حق کی طرف مائل کیا، انھوں نے اپنی کتابوں میں جابجا تصریح کی ہے کہ فلاسفہ کے الٰہیاتی علوم و مسائل بخلاف ان کے طبیعی و ریاضی علوم کے محض تخمینات ہیں، جن کی کوئی اساس نہیں "تہافت الفلاسفہ" میں لکھتے ہیں:

"وانہم یحکمون بظن وتخمین من غیر تحقیق ویقین" لیکن تعجب ہے کہ اسی کتاب میں جس کا موضوع فلاسفہ کے الٰہیاتی آراء و افکار کی تردید ہے، اسی علمی بے بنیادی کو اپنی تردید کا اصول قرار نہیں دیا بلکہ اس کے تناقض و اختلاف اور ان کی عقلی دلائل کی کمزوری پر اس مخالفت کی بنا رکھی ہے۔

عربی فلسفہ کے دور میں دوسرا عالم جس نے اس نکتہ کو بخوبی سمجھا اور فلاسفہ کی اس علمی بے بضاعتی کو اس نے اچھی طرح محسوس کیا، ابن خلدون (۸۰۸ھ ۱۴۰۶ء) ہے جو تنگ فنی اصطلاح

میں کوئی مشہور ما بعد الطبیعی فلسفی تو نہیں ہے، مگر وہ حکیم ہے جو قدرت کی طرف سے سائنٹفک دماغ لے کر آیا تھا، اور جس کا ذہن سلیم کوئی ٹیڑھی اور فرضی چیز قبول نہیں کرتا، اس نے اپنے مشہور مقدمہ میں متعدد جگہ فلسفہ پر اسی اصول سے تنقید کی ہے، (ملاحظہ ہو فلسفہ پر تبصرہ ص۳۶۷) عقل کی حدود سے بھی وہ واقف ہے، اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا کہ اس کا ایک اقتباس پیش کر دیا جائے۔

"اپنے ذہن کے اس دعوے پر کبھی اعتماد نہ کرنا کہ وہ کائنات اور اسباب کائنات کا احاطہ کر سکتا ہے، اور پورے وجود کی تفصیل پر اس کو قدرت ہے، یاد رہے کہ صاحب ادراک کے نزدیک وجود اس کے ذاتی مدرکات کا نام ہے، وجود کو وہ ان میں منحصر پاتا ہے، اور اس کے باہر وہ وجود کو یقین نہیں کرتا، حالانکہ یہ بات حقیقت نفس الامری کے بالکل خلاف ہے، بہرے آدمی کے نزدیک وجود محسوسات اربعہ اور معقولات کے دائرہ کے باہر پایا نہیں جاتا، اس کے نزدیک مسموعات موجودات کی فہرست سے بالکل خارج ہوتے ہیں، نابینا کے نزدیک مرئیات کا عالم میں وجود ہی نہیں ہوتا، اگر ان معذوروں کو اپنے زمانہ کے معقول لوگوں اور ایک جم غفیر کے کہنے کا اعتبار نہ ہو تو وہ ان موجودات کے وجود کی کبھی تصدیق نہ کریں، وہ تصدیق کرتے بھی ہیں تو یہ ان کی فطرت کا تقاضا اور ان کے ادراک کی شہادت نہیں ہوتی، اگر بے زبان جانور اپنا خیال ظاہر کر سکتا اور بولتا تو ہم سنتے کہ وہ معقولات کا کلیۃً منکر ہے، اور اس کے نزدیک ان کا قطعاً وجود نہیں، اس بنا پر کیا عجب ہے کہ ایسے بہت سے مدرکات پائے جاتے ہوں جن کے ادراک کے لئے ہمارے پاس کوئی آلہ نہیں، اس لئے کہ ہمارے یہ ادراکات محدود اور حادث ہیں اور خدا کی

قدرت اور اس کی مخلوقات اس سے کہیں زیادہ وسیع، وجود کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ فراخ اور اللہ کا احاطہ سب کو شامل ہے، بس اپنی قوتِ ادراک کی وسعت اور اپنے مدرکات کی تعداد پر ہمیشہ شبہ کرو، اور شریعت الٰہی کی تعلیمات پر اعتماد رکھو اس لئے کہ اس کو تمہاری سعادت کا تم سے زیادہ خیال اور تمہارے منافع کا تم سے زیادہ علم ہے، اس کی منزل تمہاری منزل علم سے کہیں بلند اور اس کا دائرہ تمہاری عقل کے دائرہ سے کہیں زیادہ وسیع ہے، لیکن اس واقعہ سے عقل اور اس کے مدارک پر کوئی حرف نہیں آتا، عقل ایک صحیح ترازو ہے، اس کے فیصلے یقینی ہیں، جن میں کوئی جھوٹ نہیں، لیکن تم اس ترازو میں امور توحید، امور آخرت، حقیقت نبوت، حقائق صفات الٰہی اور وہ تمام امور و حقائق جو ماوراء عقل ہیں، تول نہیں سکتے، یہ لاحاصل کوشش ہوگی، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک ترازو دیکھی جو سونے کا وزن کرنے کے لئے ہے، اس کو اسی ترازو... میں پہاڑوں کے تولنے کا شوق پیدا ہوگیا، جو ناممکن ہے، اس سے ترازو کی صحت پر کوئی حرف نہیں آتا، لیکن اس کی گنجائش کی ایک حد ہے، اسی طرح عقل کے عمل کا بھی ایک دائرہ ہے، جس سے باہر وہ قدم نہیں نکال سکتی، وہ اللہ اور اس کے صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی، اس لئے کہ وہ اس کے وجود کا ایک ذرہ ہے[1]۔"

علمائے اسلام میں امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) نے اس کی طرف اپنی کتابوں میں جا بجا اشارات کئے ہیں، اور علم کلام کے مباحث میں اس حقیقت کو بار بار واضح کیا ہے، انھوں نے متکلمین اسلام کی اصولی اور فروعی غلطیوں کی بڑی جرأت و بے باکی کے ساتھ تردید کی۔

فلسفہ کے دور آخر میں حقیقت میں جس فلسفی نے اس خود فریبی کا پردہ چاک کیا اور فلسفہ کے اس خیالی طلسم پر سب سے کاری ضرب لگائی، وہ جرمنی کا نقاد عالم ایمنول کانٹ (۱۷۲۹ء-۱۸۱۴ء)

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۲۲-۱۲۳

ہے جس نے عقل کی حدود کی سب سے زیادہ جرأت اور وضاحت کے ساتھ تعیین کی اور جس کی تنقید عقل خالص (CRITIC OF PURE REASON) نے (ڈاکٹر سر محمد اقبال کے الفاظ میں) روشن خیالوں کے کارناموں کو خاک کا ڈھیر بنا دیا۔[1]

مذہبی فلسفہ

ناانصافی ہوگی اگر ہم اس موقع پر اس فلسفہ پر تنقید نہ کریں، جو فلسفہ کے مقابلہ میں مذہب کی حمایت کے لئے وجود میں آیا لیکن وہ خود فلسفہ نہ تھا، وہی اس کا موضوع، وہی طریق بحث و استدلال اور یہی بنیادی فکر (کہ ذات و صفات الٰہی اور ماوراء عقل مسائل کو عقل سے ثابت کر سکتے ہیں) غرض دونوں میں انتہائی اختلاف و مقابلہ کے باوجود بنیادی اتحاد موجود ہے، اس مذہبی فلسفہ سے ہماری مراد علم کلام ہے جس نے ان الٰہیاتی اور مابعد الطبیعی مسائل پر اسی تحلیل و تدقیق سے کام لیا اور وہی موشگافیاں کیں جو فلسفہ نے کی تھیں، اگرچہ دونوں کے نتائج فکر اور مقاصد ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ سامعین کے لئے دلچسپ ہوگا کہ جس وقت یہ مذہبی فلسفہ فلسفہ کے مقابلہ میں میدان میں اترا اور اس نے فلسفہ ہی کے ہتھیاروں سے فلسفہ پر حملہ کیا، تو بعض فلاسفہ نے اس حملہ کا جواب اس ہتھیار سے دیا، جو دراصل فلسفہ کے مقابلہ میں استعمال کیا جا سکتا تھا، اور جو اس کے مقابلہ میں سب سے زیادہ کاری اور مؤثر ہتھیار تھا، اور جس کو "علماء کلام" غالباً جنگ کے انہماک اور سوال و جواب کے شور میں بالکل بھول گئے، یعنی "عقل انسانی کی تحدید اور ذرائع علم کی تنقید" یہ تعجب انگیز امر ہے کہ متکلمین کو فلسفہ کی زبان

---

[1] خطبۂ مدراس ۱۳

سے یہ سن کر کبھی تنبہ نہیں ہوا، اور اس اصولی بحث کو چھوڑ کر صدیوں تک فریقین جزئی مسائل اور ضمنی مباحث پر دست و گریباں رہے۔

بہر حال بعض فلاسفہ کی زبان سے اس صدا کا بلند ہونا خواہ وہ کتنی پست ہو اور کتنی دیر کے بعد بلند ہوئی ہو بہت غنیمت ہے۔

امام غزالی نے فلسفہ سے سیری اور بے اطمینانی کے بعد اس کی تردید میں ایک کتاب لکھی، جس کا نام "تہافت الفلاسفۃ" ہے، جس نے فلسفہ کے حلقوں میں خاصی بے اطمینانی پیدا کی، قاضی ابن رشد نے (جس کی وفات امام غزالی کے ۹۰ برس بعد ہوئی) جو مسلمانوں کے دور میں فلسفۂ یونان کا زبردست وکیل اور فلسفۂ ارسطو کا سب سے بڑا حامی ہے، اپنے گروہ کی طرف سے اس کتاب کا جواب "تہافت التہافت" کے نام سے لکھا ہے، اس میں ایک موقع پر امام غزالی کے ان فلسفیانہ مباحث اور تصریحات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

وهذا كله عندي تعدٍّ على	میرے نزدیک (غزالی کی یہ ساری بحث
الشريعة وفحص عما لم تأمر	و تصریح) شریعت کی حدود سے تجاوز
به الشريعة لكون قوى البشر	ہے، اور ایسے مسائل کی تحقیق ہے جن کا
مقصرة عن هذا، وذلك ان	شریعت نے حکم نہیں دیا اس لئے کہ
ليس كل ما سكت عنه الشرع	قوائے انسانی اس تحقیق سے عاجز ہیں،
من العلوم يجب ان يفحص	شریعت نے جن باتوں سے سکوت کیا
عنه ويصرح للجمهور بما ادى	ان کی تحقیق کچھ ضرور نہیں اور اپنے غور و
اليه النظر انه من عقائد الشرع	فکر کے بعد آدمی جس نتیجہ پر پہنچا ہے

فانہ یتولد عن ذلک مثل	جمہور کے لئے یہ تصریح کردہ شریعت
هذا التخليط العظيم فينبغي	کے عقائد میں سے ہے کچھ مناسب نہیں
ان يمسك من هذه المعانی	اس سے زبردست خرابی اور انتشار
کل ما سکت عنه الشرع ويعرف	پیدا ہوتا ہے پس جن مسائل ومضامین
الجمهور ان عقول الناس	سے شریعت نے سکوت کیا، ان سے
مقصرة عن الخوض فی هذه	سکوت ہی کرنا چاہیے اور جمہور کو بتلا دینا
الاشياء"[1]	چاہیے کہ عقول انسانی ان مسائل میں
	غور کرنے سے عاجز ہیں۔

متکلمین کی تردید میں اس نے جو کتاب "الکشف عن مناہج الادلۃ فی عقائد الملۃ" کے نام سے لکھی ہے، اس میں علم کلام کے طرز استدلال کے مقابلہ میں بڑی قوت کے ساتھ قرآنی استدلال کی قوت اور برتری کو ثابت کیا ہے، جو اس کی سلامت فہم کا اچھا نمونہ ہے اس نے جا بجا ان مسائل و امور کے پوری طرح سمجھنے سے "جمہور" کی بے بسی کا اظہار کیا ہے۔

ہمیں ابن رشد کی اس رائے سے کلیۃً اتفاق ہے کہ انسانوں کے قویٰ اور ان کی عقلیں ان مسائل کی تحقیق اور ان میں غور و فکر کرنے سے عاجز ہیں، لیکن ہم فلاسفہ کو انسان ہی سمجھتے ہیں، اور ہمارے نزدیک افلاطون، ارسطو، فارابی، ابن سینا اور خود ابن رشد نوع انسانی ہی کے افراد تھے۔

ان مذہبی فلاسفہ میں سب سے زیادہ "روشن خیال" اور "عقل پرست" معتزلہ کا

---

[1] تہافت التہافت ص۱۱۱

گروہ تھا جنھوں نے خدا کو انسان پر اور عالم آخرت کو دنیا پر کامل طور پر قیاس کرکے انسان کے احکام اور اس دنیا کے قوانین کی رو سے آزادانہ بحث کی اور عقل کے حدود کو مطلق نظرانداز کر دیا، غالباً عقلیت کے دور اول میں یہ خامی رہا کرتی ہے" ایک معاصر عالم فلسفہ اور سلیم الفہم ناقد اور مورخ[1] جو خود معتزلہ کا مداح اور ان کی علمی خدمات کا معترف ہے' ان کی اس کمزوری پر منصفانہ اظہار خیال کرتا ہے :-

"غالباً ان کا کمزور پوائنٹ یہ ہے کہ انھوں نے غائب کو موجود پر قیاس کرنے میں حد سے تجاوز کیا، انھوں نے اللہ تعالیٰ کو پورے طور پر انسان پر قیاس کیا، اور اس کو اس عالم کے قوانین کا تابع بنا دیا، انھوں نے اللہ کے ذمہ عدل کو اسی طرح واجب قرار دیا، جیسا کہ انسان عدل کا تصور رکھتا ہے' اور جیسا عدل کا دنیاوی نظام ہوتا ہے، انھوں نے اس کو نظرانداز کر دیا کہ عدل خود دنیا میں ایک نسبی چیز ہے' جس میں زمانہ کے تغیر کے ساتھ تغیر ہوتا رہتا ہے، قرون وسطیٰ میں جو عدل شمار ہوتا تھا، آج وہ ظلم سمجھا جائے گا، یہ تو خود اس دنیا کا حال ہے' چہ جائیکہ ہم عالم انسانی سے عالم الٰہی کی طرف منتقل ہو جائیں' اسی طرح حسن و قبیح مناسب اور مناسب تر (صلاح و اصلح) کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی نظر جب محدود ہوتی ہے، تو اشیا کے متعلق اس کا فیصلہ دوسرا ہوتا ہے' جب اس کی نظر وسیع ہو جاتی ہے' تو اس کا فیصلہ کچھ اور ہوتا ہے۔

اسی طرح ان کی یہ بحث کہ صفات الٰہی عین ذات ہیں یا غیر ذات،

---

[1] استاذ احمد امین، عمید کلیۃ الآداب جامعہ مصریہ۔

ان کے تمام دلائل غائب کے حاضر پر قیاس پر مبنی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں میں مشابہت کی کوئی چیز نہیں، انھوں نے فرض کر لیا کہ عینیت و غیریت، زمانیت و مکانیت، سببیت و مسببیت، وغیرہ ہر موجود کے لئے لازم ہیں، میری رائے میں یہ بات بالکل غلط ہے، اس لئے کہ درحقیقت یہ انسانی قوانین ہیں یا اگر ہم ذرا رعایت سے کام لیں تو ہم کہیں گے کہ یہ ہمارے عالم کے قوانین ہیں، ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ یہ قوانین ہمارے اس عالم کے علاوہ دوسرے عالم پر بھی منطبق ہوتے ہیں یا منطبق نہیں ہوتے تو اللہ کے بارے میں حکم لگانا اس اعتقاد پر کہ یہ انسانوں کے عام قوانین ہیں ایک جسارت ہے جس کو وہ عقل گوارا نہیں کرتی، جو اپنی اندازہ دان ہے، اور جو اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتی اور یہ صرف معتزلہ ہی کا عیب نہیں، بلکہ یہ ان کے بعد کے آنے والے علمائے کلام کا بھی عیب ہے[1]۔"

اشراق

عقلیت و فلسفہ کے مقابلہ میں ایک قدیم تحریک اشراق و روحانیت ہے، جس کے قدیم زمانہ میں مصر و ہندوستان بہت بڑے مرکز تھے، مشرقی مذاہب کے اثر اور مصریوں سے اختلاط کی وجہ سے حد سے بڑھی ہوئی عقل پرستی کے خلاف ایک طبعی ردعمل کے طور پر یہ تحریک یونان و روم میں بھی مقبول ہوئی، لیکن اس کا سب سے بڑا مرکز جس نے اس کو بڑا فروغ دیا، اسکندریہ تھا، جو مشرقی و مغربی عقلیت و مذاہب کا سب سے بڑا

[1] ضحی الاسلام ج ۳ صنہ المعتزلہ

سنگم اور خود مصر میں واقع تھا۔

اس تحریک و نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حق اور یقین کی دریافت کے لئے حواس، عقل، علم، قیاس، استقراء، برہان و استدلال، تحلیل و تنقید قطعاً مفید نہیں، بلکہ مضر ہیں، صداقت و حقیقت کے یقینی حصول کے لئے مشاہدہ شرط ہے، اور یہ مشاہدہ صرف نور باطن، صفائی نفس اور ایک ایسے اندرونی حاسہ کو بیدار کر دینے سے ممکن ہے، جو روحانیت اور ماوراء طبیعات کا اسی طرح ادراک کرتا ہے، جس طرح یہ ظاہری آنکھیں ظاہری چیزوں کا ادراک کرتی ہیں، اور یہ حاسہ اسی وقت بیدار ہو سکتا ہے، جب مادیت کو بالکل فنا اور حواس ظاہری کو مردہ کر دیا جائے، حقائق کی تحصیل اسی خالص و بے آمیز عقل (حکمتِ اشراق) اور اسی اندرونی روشنی (نور باطن) سے ممکن ہے، جو ریاضتوں، نفس کشی، اور مراقبہ و تفکر سے پیدا ہوتی ہے۔

درحقیقت فلسفہ اور اشراق میں اسی طرح ایک ہی روح اور ایک ہی ذہنیت کام کرتی ہے، جس طرح فلسفہ اور علم کلام میں، دونوں حقیقت کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور دونوں اس کا یقین رکھتے ہیں کہ ہم از خود اپنی کوشش سے اس کو معلوم کر سکتے ہیں، بلکہ دراصل حواس، فلسفہ، اور اشراق سب کی منزل ایک ہے، راہیں مختلف ہیں، ایک زمین پر چل کر وہاں تک پہنچنا چاہتا ہے، ایک ہوا میں اڑ کر اور ایک کسی مخفی زمین دوز راستہ سے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مادیات سے پرے ایک ایسی اقلیم ہے، جہاں حواس ظاہری کا گزر نہیں، اور اس میں شبہہ نہیں کہ انسان کے پاس ایسی باطنی طاقت اور اندرونی حاسہ ہے، جس کو اگر وہ بیدار کر لے اور ترقی دے تو اس اقلیم کے بہت سے

عجائبات اور موجودات کا ادراک کر سکتا ہے، جن کا ادراک کسی حاسۂ ظاہری سے ممکن نہیں۔

لیکن اس کا حاصل کیا ہوا؟ ان حواس ظاہری کے علاوہ ایک حاسۂ باطنی کا ثبوت اور ایک ایسے عالم کا ثبوت جہاں کے حقائق و اسرار کا ادراک حواس خمسہ سے ممکن نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ مزید حاسہ موجود ہے بلکہ ممکن ہے کہ ایسے اور دوسرے حواس بھی ہوں، اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ اس عالم کے علاوہ اور دوسری اقلیمیں بھی ہوں، جن کے علم و ادراک کے لئے انہی سے مناسبت رکھنے والی قوتیں درکار ہوں۔

لیکن یہ بہرحال ایک انسانی حاسہ ہی ہے، اسی طرح کمزور اور محدود جس طرح دوسرے حواس، اسی طرح خطا پذیر اور متاثر ہونے والا جس طرح انسان کی ساری طاقتیں، اور انکشاف علم کے سارے ذرائع، اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ حاسہ محدود اور خطا پذیر نہیں ہے، اس کے محسوسات بلکہ مشاہدات میں غلطی اور خود فریبی نہیں ہوتی۔

اگر ایسا ہوتا تو اس کے نتائج میں تعارض و تناقض نہ ہوتا، اس میں شک و احتمال نہ پیدا ہوتا، اور بڑے بڑے اہم مسائل میں لغزش اور غلط روی ممکن نہ ہوتی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس حاسہ کے محسوسات اور اس علم کی تحقیقات میں اس سے زائد تعارض و اختلاف ہے جتنا حواس ظاہری کے محسوسات میں واقع ہوتا ہے، اور اہل کشف و اشراق کے علوم و تحقیقات میں اتنا تناقض ہے جس کی نظیر شاید صرف فلسفہ میں مل سکے۔

ایک اشراقیت جدیدہ ہی کو لیجئے، اس کے ائمہ کے عقائد مذہبی اور اعمال میں

سخت اختلاف ہے، بانی اشراقیت جدیدہ فلاطینس (PLOTINUS) اپنے زمانہ کے نظام مذہبی وعبادات کا قائل نہیں اور آزاد مشرب فلسفی ہے جو صرف تفکر ومراقبہ کا قائل ہے لیکن اس کا شاگرد رشید پارفری (PORPHYRY) ایک زاہد خشک صوفی ہے۔

فلاطینس انسانی روح کے جانوروں کے جون میں ظاہر ہونے کا قائل ہے لیکن پارفری اس کا منکر ہے[1]، اس سلسلہ کا تیسرا بڑا امام پراکلس (PROCLUS) پورے مصری رسوم دینی اور مذہبی تقریبات کا پابند تھا[2]، اور دن میں تین دفعہ سورج کی پرستش کرتا تھا اس کا مذہب مختلف اعتقادات ومذاہب کا معجون مرکب تھا[3]، اور یہ سب اہل مشاہدہ ویقین تھے۔

پھر اسی اشراقیت جدیدہ نے جس نے پارفری کی قیادت میں مسیحیت کی مخالفت کی تھی، جولین (JULLIAN) کے زمانے میں رومی بت پرستی وجاہلیت (PAGANISM) کے احیا کی تحریک میں جولین کا بہت بڑا ساتھ دیا، اور بت پرستی اور مشرکانہ جاہلیت کی بڑی تائید کی، اور اس زمانہ کے اشراقیوں کی روشن ضمیری اور نور باطن نے ان کو اس غیر معقول حرکت سے باز نہ رکھا، بلکہ مذاہب واخلاق کے دائرۃ المعارف کے مقالہ نگار کے الفاظ میں اشراقیت جدیدہ نے اپنی قسمت جاہلیت کے اس ڈوبتے ہوئے جہاز کے حوالہ کردی۔

اشراقی مذاہب

یہ امر قابل ذکر ہے کہ تنزیل اور وحی پر ایمان نہ رکھنے والے مذاہب اور کشف و

---

[1] مذہب واخلاق کا انسائیکلوپیڈیا (NEO-PLATONISM) [2] ایضاً

[3] ایضاً

اشراق میں تقریباً ایک ہی روح اور ذہنیت کارفرما ہے، ایسے مذاہب کا رجحان اہل تصوف کی طرح خواہشاتِ نفس کے استیصال، رہبانیت، تجرد اور جذبات کشی کی جانب اور اس کا تنہا ذات باری میں حلول ہونا ہے، تصوف اور اشراق کی طرح یہ مذاہب بھی حق و یقین کی دریافت کے لئے ریاضت و نفس کشی اور مراقبہ و تفکر پر ہی تکیہ کرتے ہیں، غالباً اسی گہری مماثلت کی وجہ سے رومن حکومت کے عیسائیت قبول کرنے سے پہلے عیسائیت کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے مقابلہ میں اشراقیین نے رومن بت پرستوں کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا، اشراق اور ہندوستانی مذاہب کی فکری یکسانیت کو لندن یونیورسٹی کے پروفیسر جیمس نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

"درحقیقت اوپنشد کے مرتب کرنے والوں کا مقصد علم و عرفان کے حصول کے لئے ایک ایسے طریقہ' کار کی نشان دہی کرنا تھی، جس میں مراقبہ کے ذریعہ آخرکار اس توحید حقیقی کے ساتھ اتحاد مطلق قائم کیا جاسکے جو سارے وجود (برہما) پر محیط ہے، چندیوگا اوپنشد میں اسی خیال کو ایک فقرہ "تات توم اَسی" "یعنی" تو وہ ہے" میں ظاہر کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی روح (آتما) برہما کے ساتھ جو ناقابل بیان مطلق حقیقی ہے، متحد ہوجاتی ہے، کیونکہ صرف اسی صورت میں زندگی کی ان پریشانیوں سے نجات ممکن ہے، جو زمان و مکان اور علت و علل کی اس کائنات کا خاصہ ہیں، لیکن حقیقتاً ان کی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں ہے، جس وقت یہ روحانی مسرت حاصل ہو جاتی ہے تو اسے روحانی آسودگی یا "مزدان" سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کے لفظی معنی ہیں، بجھ جانا

یا ٹھنڈا ہو جانا، نروان اگرچہ بدھ مذہب کا نصب العین ہے، مگر یہ اوپنشد کے تصور نجات یعنی "موکش" سے قطعاً مختلف نہیں ہے"[۵۱]

انسائیکلوپیڈیا مذاہب و اخلاق کے مقالہ نگار پروفیسر وی۔ ایس۔ گھاٹے (V. S. GHATE) جو الفنسٹن کالج بمبئی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے، کہتے ہیں کہ شنکراچاریہ کا سب سے بڑا مقصد آٹھویں صدی عیسوی کے آخر میں اوپنشد کے اس فلسفہ کو زندہ کرنا تھا جس میں مطلق وحدۃ الوجود کی تعلیم دی گئی ہے، پروفیسر گھاٹے کے خیال میں شنکراچاریہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اوپنشد کی ان تعلیمات کو ہم آہنگ کر دیا جو ایک دوسرے سے معارض اور مختلف تھیں اور جن میں ایک طرف تو مطلق وحدۃ الوجود کو ایک ایسی اعلیٰ حقیقت کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، جو تمام صفات سے عاری ہے، اور جسے صرف نفی صفات کے ذریعہ ہی بیان کیا جا سکتا ہے، اور دوسری طرف تعدد آلہہ کو اس طور پر پیش کیا گیا ہے کہ اسباب و علل کی یہ بلند ترین کڑی صفات سے بھی متصف ہے، اور داخلی طور پر تمام نظام عالم پر محیط و متصرف بھی۔[۵۲]

لیکن وحدت اور کثرت کے ان مختلف تصورات کی تطبیق کیونکر ممکن ہو سکی اور اس کا نتیجہ کیا ظاہر ہوا؟

شنکراچاریہ نے "مایا" کے اصول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "عرفان" اور "نجات" یعنی "موکش" کو دو مختلف معنے دے دیئے جو اعلیٰ اور ادنیٰ سطح پر "برہما" کے تصور سے ہم آہنگ تھے، اعلیٰ سطح پر عرفان کا مطلب یہ ہے کہ برہما ایک مطلق وحدت ہے،

---

۵۱ ای۔ او۔ جیمس۔ ہسٹری آف ریلیجنس۔ لندن (۱۹۶۴) ص۲۳

۵۲ انسائیکلوپیڈیا مذاہب و اخلاق (۱۹۵۸) مضمون شنکراچاریہ

جس کے سوا کسی اور شئے کا وجود نہیں ہے، دوسری طرف ادنیٰ سطح پر برہما فرد کے ذاتی خالق اور مالک کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جسے ایشور کہا جاتا ہے، اور جس کی عبادت ہی اس کے عرفان کا ذریعہ ہے، اس طرح شنکراچاریہ نے بیک وقت کرم یعنی عمل اور ظاہر پرستی کی تنقیص کے ساتھ ساتھ عوام الناس میں مقبول دیوی دیوتاؤں اور ان کی مورتیوں کی پوجا کا جواز پیدا کر دیا، کیونکہ شنکراچاریہ کے خیال میں ایسے لوگ جو اتنا ہی وجود اعلیٰ کا عرفان اس لئے نہیں حاصل کر سکتے کہ وہ غیر مبدل اور صفات سے عاری ہے، ان کے لئے مورتی پوجا کے ظاہری رسوم علامت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مختلف النوع تصورات میں ہم آہنگی پیدا کرنا شنکراچاریہ کا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے، مگر اس قسم کی تطبیق صرف کشف و اشراق کا سہارا لے کر ہی ممکن ہو سکتی ہے، کیونکہ روحانی مکاشفات میں ایک ہی حقیقت مختلف رنگوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

اس موقعہ پر یہ حقیقت بھی قابل اظہار ہے کہ مسلمان صوفیوں میں بھی کشف و اشراق نے بڑی اہمیت اور قطعیت حاصل کر لی تھی، ان کے یہاں بھی آپ مشاہدۂ حق اور حصول یقین بطریق کشف کی کوششیں اور رجحانات پائیں گے، حالانکہ ان کے لئے اس کا ذریعہ صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کا عطا کیا ہوا علم تھا۔

شیخ اکبر شیخ محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ھ — ۱۲۴۰ء) رحمۃ اللہ علیہ نے امام فخر الدین رازی کو جو خط لکھا ہے، اس میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

ویجل اللہ سبحانہ ان یعرفہ	اللہ سبحانہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کو
العقل بنظرہ و فکرہ فینبغی	عقل اپنے غور و فکر سے معلوم کرے پس
للعاقل ان یخلی قلبہ عن	عاقل کو چاہیے کہ وہ اپنے قلب کو فکر سے

الفکر اذا اراد معرفۃ اللہ	خالی کرے اگر وہ اللہ کی معرفت مشاہدہ
من حیث المشاھدۃ۔	کے طور پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

فارفع الھمۃ فی ان لاتاخذ	اس کے لئے اپنی ہمت بلند کرو کہ علم صرف
علما الامنہ سبحانہ علی الکشف	اللہ سے بطریق کشف حاصل کرو اس لئے کہ
فان عند المحققین ان لافاعل	محققین کا مسلک ہے کہ اللہ ہی سے اخذ
الا اللہ فاذن لایاخذون الا	کرتے ہیں، لیکن بطریق کشف نہ بطریق عقل
عن اللہ لکن کشفا لاعقلا ومافاز	اور محض اسی عین الیقین تک پہنچنے کی وجہ
اھل الھمۃ الابالوصول الی عین	سے اہل ہمت کامیاب ہوئے ان کی ہمت
الیقین انفۃ بقاءٍ مع علم الیقین[1]	وغیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ علم الیقین پر
	قانع رہیں۔

امام غزالی کو بھی تلاش حق ویقین کے سفر میں جس منزل پر پہنچ کر اطمینان ہوا وہ جیسا کہ "المنقذ من الضلال" میں لکھتے ہیں، "یہی بات تھی کہ تصوف کے ذریعہ حقیقت کا مشاہدہ اور عین الیقین حاصل ہوتا ہے" ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

واعلم انہ ھذا ھو الحق الیقین	جان لو کہ محقق علماء کے نزدیک حق الیقین
عند العلماء الراسخین فی العلم	یہی تھا جسے انھوں نے مشاہدۂ باطن کے
اعنی انھم ادرکوہ بمشاھدۃ	ذریعہ پایا تھا، اور مشاہدۂ باطن آنکھوں کے
من الباطن ومشاھدۃ الباطن	مشاہدے سے کہیں زیادہ قوی اور برتر ہوتا ہے

[1] ثلاث رسائل۔

اقوی واجل من مشاھدۃ الابصار	ان علماء نے اس یقین میں تقلید
وترقوا فیہ عن حد التقلید الی	سے نکل کر تحقیق کی منزل تک
الاستبصار۔[1]	ترقی کی۔

مسلمان اہل اشراق وکشف کے کشوف ومشاہدات میں بھی غلطی کا احتمال اور اختلاف وتعارض ہے[2]، ایک صاحب کشف، دوسرے صاحب کشف سے اختلاف کرتا ہے، اس کے کشف کو امر واقعی کے غیر مطابق بتلاتا ہے، کبھی اس کو سکر اور غلبۂ حال پر محمول کرتا ہے، اور کبھی کہتا ہے کہ یہ مقام ایک عارضی اور ابتدائی مقام ہے، جس سے سالک گزرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے، اور اس وقت اس کو پہلے مقام کے کشف ومشاہدات کے خلاف نظر آتا ہے۔

اہل اشراق وکشف میں...... شیخ اکبر شیخ محی الدین ابن عربی علیہ الرحمۃ کا جو درجہ ہے، اہل علم اس سے واقف ہیں، ان کے متعلق اس فن کے دوسرے امام اور صاحب کشف ومقامات حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں "عجائب کاروبار است شیخ محی الدین از مقبولان در نظر می آید واکثر علوم او کہ مخالف آرائے اہل حق

---

[1] بحوالہ کتاب النبوات امام ابن تیمیہؒ۔ [2] ڈاکٹر رادھا کرشنن روحانی ترقی کے لئے عبادات ورسوم کے پابند مذاہب کے مقابلہ میں کشف واشراق کو ترجیح دیتے ہیں مگر انھوں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ "انسانی روح کی بنیادی داخلی یکسانیت، یہ مطلب نہیں کہ کشوف ومشاہدات میں بھی یکسانیت ہوتی ہے، ان کے کشف میں اختلاف پایا جاتا ہے، مثلاً جس طرح مشرقی متصوفین میں اوپنشد، بھگوت گیتا، شنکرا، رام نج، رام کرشن، بدھ مت اور جلال الدین رومی کے کشوف ومشاہدات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اسی طرح مغرب میں افلاطون (PLATO) پال (PAUL) پراکلس (PROCLUS) ٹاؤلر (TAULER) پلاٹینس (PLOTINUS) اور اکہارٹ (ECHART) کے یہاں بھی اختلاف وتعارض موجود ہے، یہ اختلاف موسم یا جغرافیائی حالات کی پیداوار نہیں بلکہ ایک ہی نسل اور تہذیب کے متصوفین مختلف روایات اور رجحانات (باقی ص ۳۳ پر)

اند خطا دنا صواب ظاہر می شود"۔[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں "اکثر معارف کشفیہ او کہ از علوم اہل سنت جدا افتادہ است از صواب دور است"۔

مسئلہ وحدت الوجود میں شیخ اکبر اور شیخ مجدد کا جو اختلاف ہے، وہ سب کو معلوم ہے، اور دونوں بزرگوں کی تحقیق ذاتی مشاہدہ اور کشف پر مبنی ہے، مجدد صاحب نے اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہؒ اور خود اپنے متعلق لکھا ہے کہ وہ دونوں پہلے اسی مقام پر تھے کہ توحید وجودی کا ان پر غلبہ تھا، اور مقدمات کشفیہ اور دلائل یقینی سے اس کی تائید ہوتی تھی، لیکن جب وہ خدا کی توفیق سے اس مقام سے بلند ہوئے تو انھوں نے اس سے رجوع کیا فرماتے ہیں:۔

"معرفت پناہی قبلہ گاہی حضرت خواجۂ ما قدس اللہ تعالےٰ سرہٗ چند گاہ مشرب توحید وجودی داشتند و در رسائل و مکتوبات خود آنرا اظہار می فرمودند اما آخر کار حق سبحانہ وتعالےٰ بہ کمال عنایت خویش از آن مقام ترقی ارزانی فرمودہ بشاہراہ انداختہ از مضیق ایں معرفت خلاصی داد، میاں عبدالحق کہ یکے از مخلصان ایشانند نقل کردند کہ پیش از مرض موت ایشان بیک ہفتہ فرمودہ اند کہ مرا بعین الیقین معلوم شد کہ توحید کوچہ ایست تنگ شاہراہ دیگر است پیش ازیں ہم میدانستم اما اکنوں یقینے دیگر حاصل گشت"۔

آگے چل کر اسی خط میں اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"وایں حقیر نیز چند گاہ در حضرت ایشاں ایں مشرب توحید داشت و مقدمات

(باقی ص۳۳ کا) کے حامل ہوتے ہیں" (ایسٹرن ریلیجن اینڈ ویسٹرن تھاٹ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن (۱۹۴۰)

ص۳۴) [1] مکتوبات ج ۱ مکتوب ۲۶۶

کشفیہ در تائید ایں طریق بسیار رائج گشتہ بودند اما عنایت خداوندی جل سلطانہ ازاں مقام گزرانیدہ بمقامے کہ خواست مشرف گردانید۔"[1]

عقل اور علوم روحانی میں غلطی کا جو امکان ہے' اس کو ایک مکتوب میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"سوال، عقل فی حد ذاتہ ہر چند در احکام الٰہی جل شانہ' ناقص و ناتمام است اما چرا نتواند کہ بعد از حصول تصفیہ و تزکیہ عقل را مناسبتے و اتصال غیر متکیف بمرتبہ وجوب تعالیٰ و تقدس پیدا شود کہ بسبب آں مناسبت و اتصال احکام ازیں جا اخذ نماید و حاجت بہ بعثت کہ بتوسط ملک است نشود۔"

یہ مذہب اشراق کی پوری پوری ترجمانی اور وکالت ہے' اب اس کا جواب اس شخص کی زبان سے سنئے جو اس کوچہ سے بخوبی واقف ہے' اور جس کو اس "تصفیہ" اور "تزکیہ" کا عملی تجربہ ہے۔

"جواب:۔ عقل ہر چند آں مناسبت و اتصال پیدا کند اما تعلقے کہ بایں پیکر ہیولانی، داشت بالکل زائل نہ گردد و تجرد تمام نہ پیدا کند' پس واہمہ ہمیشہ دامن گیر او بود و متخیلہ ہرگز خیال او وا نہ گزارد و قوت غضبیہ و شہویہ ہموارہ مصاحب او بودند و رذیلہ حرص و شرہ ہمہ وقت ندیم او باشند' سہو و نسیان کہ از لوازم نوع انسان است ازو منفک نبوند' و خطا و غلط کہ از خواص ایں نشأۃ اند از وجدا نباشد پس عقل شایان اعتماد نبود و احکام ماخوذہ او از سلطان وہم تصرف و خیال مصون نہ بوند و از شائبہ نسیان و مظنہ خطا

---

[1] مکتوبات ج ۱ مکتوب ۲۳

محفوظ نباشند، بخلاف ملک کہ ازیں اوصاف پاک است وازیں رذائل مبرا پس

ناچار شایان اعتماد بود واحکام ماخوذہ او از شائبہ وہم وخیال ومظنہ نسیان وخطا

مصئون باشند، ودر بعضے اوقات محسوس میگردد کہ علومیکہ بہ تلقی روحانی اخذ

نمودہ است در اثنائے تبلیغ آں بقوئی حواس بعضے از مقدمات مسلمہ غیر صادقہ

کہ از راہ وہم وخیال یا غیر آں حاصل شدہ اند بے اختیار بآں علوم منضم می شود

بحیثیتے کہ در آں وقت اصلا تمیز نتواند کرد ودر ثانی الحال گاہ بود کہ علم آں

تمیز دہند وگاہ نہ دہند پس لاجرم آں علوم بواسطہ خلط آں مقدمات ہیئتہ،

کذب پیدا می کنند واز اعتماد می بر آیند۔"[1]

درحقیقت جیسا کہ حضرت مجدد نے لکھا ہے، انسان کی قوت عقلی ہو یا قوت روحانی، کوئی قوت اس کے حواس اور خارجی موثرات کے اثر سے بالکلیہ آزاد نہیں، اس کے ماحول، اس کے افکار وعقائد، اور ان مقدمات کا جو اس کے یا اس کی جماعت اور قوم کے نزدیک مسلم ہیں، اس کی تحقیقات اور مشاہدات پر ضرور اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے، کہ اشراقیوں کو اپنے کشف ومشاہدہ میں بہت سے یونانی اور مصری اوہام وخیالات کی تائید نظر آتی تھی، اور مسلمان اشراقیوں کو فلسفۂ یونان کے بہت سے مفروضات حقیقت بن کر نظر آتے تھے، وہ "عقول" کا مشاہدہ کرتے تھے، اور عقل اول سے بعض اوقات ان کا مکالمہ اور مصافحہ ہوتا تھا۔

پھر اگر اس حاسہ کی قوت پورے طور پر تسلیم بھی کر لی جائے تو سوال یہ ہے کہ اس حاسہ کے محسوسات کیا ہیں، اس سے کن چیزوں کا ادراک ہو سکتا ہے، بایں ہمہ

---

[1] مکتوبات ج ۱ مکتوب ۲۶۶

نیست کہ عالم ارواح کے اسرار و عجائبات کی سیر ہوتی ہے، اور آدمی اس کی وسیع فضاؤں میں آزادانہ پرواز کرتا ہے، ایک پورا عالم اس کے ایک نئے حاسہ پر منکشف ہوتا ہے، اور اس کو کچھ صورتیں نظر آتی ہیں، کچھ رنگ نظر آتے ہیں، اس سے اس کو خدا کی قدرت اور کائنات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن بقول حضرت مجدد یہ سب لہو و لعب میں داخل ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"کہ "حسی" صور و انوار کیا کم ہیں کہ کوئی ان کو چھوڑ کر ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ غیبی صور و انوار کی ہوس کرے، یہ صور و انوار اور وہ صور و انوار دونوں اللہ کی مخلوق ہیں، اور اس کی صنعت کا نمونہ ہیں، آفتاب و ماہتاب کی روشنی کو جو اس عالم شہادت میں پائی جاتی ہے، ان انوار پر جن کو وہ عالم مثال میں دیکھتے ہیں، کئی وجوہ سے، ترجیح حاصل ہے، لیکن چونکہ یہ دید دائمی ہے، اور عوام و خواص سب اس میں شریک ہیں، اس لئے اس کی قدر نہیں ہوتی اور انوار غیبی کی دید کی ہوس کرتے ہیں۔ ع

آبے کہ رود پیش درت تیرہ نماید"[1]

اس اشراق و نور باطن اور مکاشفات و مشاہدات سے وہ اصولی اور مرکزی سوالات کہاں حل ہوتے ہیں، جن کے جواب سے حواس و عقل اور فلسفہ قاصر رہا، خالق کے منشاء کا تفصیلی علم، اخلاق و اعمال کا متعین نظام ان کی دسترس سے بھی اسی طرح باہر ہے، جس طرح عقل و فلسفہ کی سرحد سے، یہی وجہ ہے کہ اشراقی اپنے اپنے وقت

[1] مکتوبات ج ۱ مکتوب ۲۰۹

اور اپنے اپنے زمانہ کے کسی نہ کسی روحانی اور اخلاقی نظام سے منسلک رہے، اور کوئی مفصل و مثبت مذہبی نظام نہ پیدا کر سکے۔

مسلمانوں میں کشف و اشراق میں شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا جو بلند مقام ہے، وہ سب کو تسلیم ہے، لیکن بایں ہمہ وہ ظاہری مسلک رکھتے تھے، اور ان کے اتباع سنت اور پیروی شریعت کا حال واقفان حال سے پوشیدہ نہیں!

قبل اس کے کہ میں ان مسائل کو یقینی طور پر حل کرنے کے آخری ماخذ کا ذکر کروں، جو میرے نزدیک وحی اور تنزیل ہے، اور جس کا ذریعہ نبوت و رسالت ہے، اور اس طرز زندگی کا خاکہ آپ کے سامنے پیش کروں، جو نبوت و رسالت کی پیروی اور ان کی تعلیمات کے اتباع سے وجود میں آتی ہے، اور ان کے اصول و اساس پر دنیا میں قائم ہوتی ہے، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان تمدنوں اور نظام حیات کا ذکر کردوں جو محض حسیات یا عقلیات یا اشراق کے افکار و نظریات پر قائم ہوتا ہے۔

دنیا کے تین اہم تمدن اور نظام حیات

حِسّی تمدن

دنیا کا ایک قدیم ترین تمدن اور انسانوں کا مقبول ترین تمدن وہ ہے، جس کی بنیاد حواس اور ان کے نتائج پر ہوتی ہے، انسان کے لئے اس بنیاد سے زیادہ آسان اور عام بنیاد اس سے زیادہ سہل تجربہ، اس سے زیادہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں آسانی کے ساتھ وقوع میں... آجانے والا اور اس سے زیادہ انسان کی خواہشوں کو تسکین دینے والا کوئی نظام نہیں، اس میں کسی گہرائی، کسی عقلی ترقی، اور کسی ایثار و قربانی کی ضرورت نہیں، اس لئے عام انسانوں کے لئے یہ سب سے زیادہ کشش رکھتا ہے، اور انسانی تہذیب کی تاریخ میں اس سے زیادہ کسی اور نظام حیات نے بار بار فتح نہیں پائی۔

حِسیات پر جس تمدن کی بنیاد ہوگی، اس کی فطری خصوصیات لازماً حسب ذیل ہوں گی۔

(۱) ہر ایسی چیز کا انکار یا اس کی بے وقعتی جو حواس کے تحت میں نہ آسکے، اور جس کی تصدیق مجرد حواس ظاہری سے نہ ہوتی ہو، اس اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی بِن دیکھی ذات اور طاقت کا یقین پیدا نہیں ہوگا، جو حواس سے بالاتر ہے، اور جب اس کا یقین ہی پیدا نہ ہو تو اس کا لحاظ اور خوف یا اس سے امید پیدا ہی نہیں ہو سکتی اگر منکر کا

اثرات اور اوہام کی وجہ سے (جو حواس پرستی کے دور میں حسیّت اور مادیت کے ساتھ ساتھ اکثر کارفرما ہوتے ہیں) متعدد آلہہ کا اعتقاد موجود بھی ہوتا ہے تو اس کا ذہن اور دماغ اور عملی زندگی پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اور اس سے اس تمدن کی حسیت زندگی کے حسی رجحان، اخلاق و اعمال کی حسی بنیاد میں کوئی تزلزل واقع نہیں ہوتا۔

جب کسی چیز کے ثبوت کے لئے حواس کی شہادت ضروری قرار پائے تو پھر ایسی چیز کے یقین، اور زندگی میں اس کے لحاظ کی کیا گنجائش باقی رہتی ہے، جس کے وجود کی حواس شہادت نہیں دیتے، اس لئے اس حسی استدلال کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس زندگی کے بعد کسی دوسری زندگی اور اس عالم کے علاوہ کسی اور عالم کے وجود کا مطلق انکار کیا جائے، جو حواس کے علاوہ کسی اور دلیل سے ثابت کیا جاتا ہے یا جس کو ماننے کے لئے محسوسات کے علاوہ کسی اور چیز کا وجود ماننا پڑتا ہے، اس زندگی علاوہ دوسری زندگی کے وجود کے انکار کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی زندگی منتہائے نظر بن جاتی ہے، کسی آئندہ محاسبہ کا ڈر باقی نہیں رہتا، طبیعت میں وہ آزادی اور بے قیدی پیدا ہو جاتی ہے، جس پر عارضی قانونی حدود اثر انداز نہیں ہو سکتے، اور چونکہ زندگی بعد موت کی طرح حواس کی بنا پر موت اور اس زندگی کے خاتمہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اور یہ واقعہ ہر طرح حواس کی ناقابل تردید اور متواتر شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے، اور اس کا دن رات مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے حیات بعد الموت کے انکار اور موت کے اقرار کا لازمی اور طبعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زندگی سے پورے طور پر فائدہ اٹھانے اور اس میں عیش و لطف کرنے کا عقلی و طبعی تقاضا پیدا ہوتا ہے، جو اس طریق استدلال اور اس ترتیب مقدمات کے ساتھ ہر طرح معقول و حق بجانب ہے۔

اسی حسی تمدن کے ابتدائی دور میں (اور بعض اوقات ترقی یافتہ دور میں بھی) اخلاق کے بجائے عمل کے محرک' اغراض' مصالح اور ذاتی منافع ہوتے ہیں' اجتماعی زندگی کی وجہ سے جب اس تمدن میں ترقی ہوتی ہے تو "اخلاق" کا لفظ بھی اس کی زبان میں پیدا ہو جاتا ہے' لیکن ... کی بنیاد لذتی فلسفہ پر ہوتی ہے' یعنی اخلاق کا معیار یہ ہے کہ ان سے انسان کو لذت یا حظ نفس حاصل ہو' پھر جب کچھ اور ترقی ہوتی ہے تو لذتیت کے بجائے ان کی بنیاد افادیت بن جاتی ہے' یعنی اخلاق کا معیار یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ افراد کو فائدہ پہنچے (لیکن اس فائدہ کا معیار مقرر کرنے میں بھی عموماً حسی نقطہ نظر اور لذتی ذہنیت کام کرتی ہے۔)

(۲) اس مادہ پرستانہ اور حسی تمدن کی دوسری فطری خصوصیت (جو درحقیقت پہلی خصوصیت ہی کا ضمیمہ ہے) یہ ہے کہ محسوسات میں بھی قرض کے مقابلہ میں نقد' آجل (بہ دیر) کے مقابلہ میں عاجل (جلد) کو ترجیح دی جاتی ہے' اس لئے کہ وہ حواس سے زیادہ قریب ہوتا ہے' اور اس میں عقلیت اور قوت فکریہ کے استعمال کی ضرورت نسبتاً کم ہوتی ہے' اس لئے اس تمدن یا اس آئینِ زندگی کے تمام مظاہر و اشکال میں ایک خاص قسم کی سطحیت و ظاہریت اور پورے نظام زندگی میں نفع اندوز ذہنیت اور خود غرضی' اور انفرادیت کام کرتی ہے۔

اس مادہ پرستانہ ذہنیت اور سیرت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اصول و اخلاق اور عقائد پر منافع اور مصالح کو ترجیح دی جاتی ہے' بڑے بڑے اصول کو' اہم سے اہم عقیدہ' اور بہتر سے بہتر اخلاقی تعلیم کو حقیر سے حقیر فائدہ اور ادنیٰ سے ادنیٰ تر مصلحت پر ہر وقت قربان کیا جا سکتا ہے' چنانچہ اس ذہنیت اور سیرت کے لوگ (خواہ وہ کسی

مذہبی جماعت میں پائے جائیں، اور بہت سے مذہبی فرائض و شعائر کے پابند ہوں) ہر قسم کے نظام کے ساتھ تعاون کر لینے کے لئے تیار رہتے ہیں، ان میں ہر چلتی ہوئی مشنری میں فٹ ہو جانے کی عجیب و غریب صلاحیت ہوتی ہے، اور ہر سانچہ میں ڈھل جانے کی ایسی قابلیت ہوتی ہے، جو شاید موم میں بھی نہ ہو، وہ ہر نظام کا کل پُرزہ بن سکتے ہیں، ہر جھنڈے کے نیچے لڑ سکتے ہیں، اور ہر مقصد کے لئے جان دے سکتے ہیں، اور لے سکتے ہیں، بشرطیکہ اس میں ان کا کچھ بھی ذاتی نفع ہو خواہ اس کی مقدار کتنی ہی کم ہو اور خواہ وہ محض موہوم اور بالکل مشتبہ ہو، یہ فلسفہ کسی ذاتی فلسفہ کی حدود سے نکل کر قومی فلسفہ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے، اور دونوں حالتوں میں اپنے لئے اور قوم کے لئے اس کی دعوت یہی ہوتی ہے کہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"۔ اور ع

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

(۳) اس حسی تمدن اور نظام میں چونکہ علم کے ماخذ صرف حواس ہوتے ہیں، اور حواس جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے انسان کے متعلق اس سے زیادہ اور کوئی شہادت نہیں دیتے کہ وہ صرف ایک "بولنے والا جانور" (حیوان ناطق) ہے، اس لئے اس کے سلسلۂ تاریخ کے گم شدہ حلقے دریافت کرنے کے لئے اور اس کی زندگی کے احکام و ضوابط معلوم کرتے کے لئے حیوان ہی کی طرف رجوع کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے، اور انسان کی زندگی کا ایسا نظام تجویز کیا جاتا ہے، جو اپنی روح اور مقاصد میں خالص حیوانی زندگی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔

میرے بار بار حسی اور حیوانی کے الفاظ استعمال کرنے سے آپ کو غلط فہمی نہ ہو کہ حسی تمدن جنگل کی ایک زندگی ہے، جس میں شہریت اور شائستگی مفقود ہوتی ہے،

دراصل میں اس کو اس کے ماخذ اور روح کے اعتبار سے حسّی کہہ رہا ہوں، ورنہ شہری زندگی کے اعتبار سے یہ دنیا کا ترقی یافتہ ترین تمدن ہے، زندگی کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور پُرراحت بنانے کے... اعتبار سے مادی زندگی کے تنوعات اور ترقیات اور اس بارہ میں ہر قسم کی تدقیق اور ایجادات کے اعتبار سے، الہامی تمدن اور بعض اوقات عقلی تمدن اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس کا جتنا حق اس تمدن کو ہے کسی دوسرے تمدن کو نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا سرمایہ ہی یہی ہے۔

یہ تمدن دنیا میں سب سے زیادہ پھلا پھولا، اس نے اپنی صنعتوں سے زمین کو گلزار اور دلچسپیوں سے زندگی کو باغ و بہار بنا دیا، پہاڑوں کے جگر سے پانی کی نہریں بہائیں، اور پتھر کے سینہ پر پھول کھلائے، شاندار یادگاریں قائم کیں، پُرشکوہ عمارتیں تعمیر کیں، اور انسانی صنعت اور ذکاوت کے ایسے نادر نمونے دنیا میں پیش کئے کہ اس پر حکیمانہ اور عقلی تمدن ہونے کا دھوکا ہونے لگا، لیکن درحقیقت اس نے عقل کو اپنے حسّی اور مادی فوائد کے لئے مسخر کیا تھا۔

جزیرۃ العرب میں عہد قدیم میں "عاد" کے نام سے ایک قوم ہوئی ہے، جو اپنے زمانہ میں حسّی اور مادی تمدن کی بڑی نمائندہ تھی، ان کا تمدن اس زمانہ کا بڑا ترقی یافتہ تمدن تھا، اور ان میں حسّی تمدن کی اکثر خصوصیات پائی جاتی تھیں، ان کی زندگی کو دیکھ کر نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ یہ ایک ناخدا شناس اور منکر آخرت قوم کی زندگی ہے، وہ بے ضرورت محض لطف و تفریح یا نام و نمود کے لئے بڑی بڑی عمارتیں اور یادگاریں تعمیر کرتے تھے، جن کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بنانے والے آخرت کو بھولے ہوئے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے، ان کی جنگوں اور

دار و گیر سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے سوا کسی بلند و بالا طاقت کا یقین نہیں رکھتے۔

ان کے پیغمبر نے ان کو اس طرح مخاطب کیا:-

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ	کیا بناتے ہو ہر بلند جگہ پر ایک نشان
وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ	محض کھیل تماشہ کے لئے بیکار اور ایسی
تَخْلُدُوْنَ وَاِذَا بَطَشْتُمْ	کاریگریاں دکھاتے ہو جیسے کہ تم کو ہمیشہ
بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ	رہنا ہے، اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو
(شعراء ـــــ ۱۳۰-۱۲۸)	تمہاری گرفت زبردست اور ظالمانہ ہوتی ہے

ان کی جانشین قوم ثمود کے بھی دنیا کی زندگی میں انہماک اور اس میں ان کے سکون و اطمینان، دوسری زندگی سے غفلت اور اس کے معاملہ میں بے سرو سامانی کو دیکھ کر اسی کا اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی ایسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے، جو ان کو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی، ان کے پیغمبر نے ان سے اس طرح خطاب کیا:-

اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَا اٰمِنِيْنَ فِيْ	کیا تم یہاں کی چیزوں میں چھوڑ دیئے
جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ	جاؤ گے بے کھٹکے باغوں میں اور چشموں
طَلْعُهَا هَضِيْمٌ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ	میں اور کھیتوں اور کھجوروں میں جن کا
الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ	خوشہ ملائم ہے اور بڑے تکلف سے
(شعراء ۱۴۶-۱۴۹)	پہاڑوں میں گھر تراشتے ہو۔

حسیت و مادیت اور مظاہر پرستی (اور اس کی ترقی یافتہ شکل بت پرستی) کچھ لازم و ملزوم سے ہیں، حواس و مادہ پرست قوموں کی مذہبیت عموماً اصنام پرستی کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے، ایک ایسے خدا کا تصور جو نگاہوں سے مخفی ہو، جس کی کوئی

جسمانی شکل توجہ کو اپنے اوپر مرکوز کرنے کے لئے سامنے موجود نہ ہو، حواس پرستوں اور محسوسات کے خوگر انسانوں کے لئے بہت دشوار ہوتا ہے، وہ اپنے اس جذبہ کو تسکین دینے کے لئے جلد بت تراش لیتے ہیں، اور اپنی زندگی کے اس روحانی شعبہ کو بھی دوسرے شعبوں کی طرح حسی بنا لیتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک ایسی ہی قوم میں پیدا ہوئے تھے، جو اپنی مادی زندگی کے دوسرے لوازم کے ساتھ بت پرستی میں بڑی ترقی کر گئی تھی:۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ	اور ان کو ابراہیم (علیہ السلام) کی خبر
لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝	سناؤ، جب انھوں نے اپنے باپ اور اپنی
قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا	قوم سے کہا کہ تم کس کی پرستش کرتے ہو
عٰكِفِيْنَ ۝ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ	انھوں نے کہا کہ ہم مورتوں کی پرستش
اِذْ تَدْعُوْنَ ۝ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ	کرتے ہیں، اور سارے دن انھیں کے
اَوْ يَضُرُّوْنَ ۝ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ	پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں، کہا وہ تمہارا
اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ قَالَ	کہا کچھ سنتے ہیں جب تم پکارتے ہو یا
اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝	کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا بُرا، بولے نہیں
اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝	پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو یہی کام
فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ	کرتے پایا، کہا بھلا دیکھتے ہو جن کو تم
الْعٰلَمِيْنَ ۝ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ	پوجتے رہے ہو تم اور تمہارے باپ دادے
فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝ وَالَّذِيْ هُوَ	اگلے سو وہ میرے حریف ہیں، مگر سارے
يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۝ وَاِذَا	جہانوں کا پروردگار جس نے مجھے بنایا

مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ وَالَّذِيْ	سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے اور وہ جو
يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۝ وَالَّذِيْٓ	مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے' اور جب
اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ	میں بیمار ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے'
يَوْمَ الدِّيْنِ ۝	اور وہ جو مجھ کو مارے گا پھر جلائے گا اور
(شعراء ۶۹-۸۲)	وہ جو مجھ کو توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر
	انصاف کے دن۔

اس بڑھتی ہوئی مادیت وحسیت اور اصول اخلاق کے مقابلہ میں جذبات و خواہشات کی پیروی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت انسانی مسخ ہوتی چلی جاتی ہے' وجدان سلیم ماؤف اور اخلاقی حس مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے' اور انسان مسخ فطرت کے اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے' جہاں حیوان بھی نہیں پہنچتا' حضرت لوطؑ ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے تھے' جو اخلاقی انحطاط اور فطرت کے تنزل کے اسی مقام پر تھی' وہ فرماتے ہیں:۔

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝	کیا تم دوڑتے ہو جہاں کے مردوں پر چھوڑتے
وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ	ہو جو تمہارے واسطے بنا دی ہیں' تمہارے
مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ	پروردگار نے بیویاں بلکہ تم لوگ حد سے
عٰدُوْنَ ۝ (شعراء-۱۶۶-۱۶۵)	بڑھنے والے لوگ ہو۔
اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ	کیا تم دوڑتے ہو مردوں پر اور راہ
السَّبِيْلَ ڏ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ	مارتے ہو راستہ چلنے والوں کی اور اپنی
الْمُنْكَرَ ۭ (عنکبوت۔ ۲۹)	مجلس میں نامعقول حرکات کرتے ہو۔

نفع اندوز ذہنیت اور فائدہ جو طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ جائز و ناجائز قانونی

اور غیر قانونی عمل کا خیال نہیں کرتی، اور اجتماعی نفع اور نظم کے مقابلہ میں شخصی منفعت کا لحاظ کرتی ہے، خواہ اس سے کتنے ہی تمدنی مفاسد اور اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں تجارت میں خیانت اور بد دیانتی، وزن کرنے میں کمی، زیادتی، اس ذہنیت اور سیرت کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

مدین کے تجارت پیشہ لوگوں میں یہ مرض بہت عام تھا، ان کے پیغمبر نے ان کو خاص طور پر اس طرف متوجہ کیا:۔

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ	پورا بھر کر دو ناپ اور نقصان دینے
الْمُخْسِرِينَ ٥ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ	والے مت ہو اور تولو سیدھی ترازو
الْمُسْتَقِيمِ ٥ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ	سے اور مت گھٹا دو لوگوں کو ان کی
اَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ	چیزیں اور ملک میں خرابی ڈالتے
مُفْسِدِينَ ٥ (شعراء ۸۳-۱۸۱)	مت پھرو۔

مصر و شام، عراق و ایران اور یونان اپنے اپنے دور میں اس تمدن کے مرکز تھے، اور یہ تمدن وہاں اپنی فطری خصوصیات کے ساتھ پایا جاتا تھا۔

رومی تمدن حسیت اور مادہ پرستی کا ایک شاہکار تھا، جس میں حسی فلسفہ، اخلاق و اجتماع، مادہ پرستانہ مقصد زندگی اور طرز زندگی پورے طور پر نمایاں ہے، اور خیالات و افکار، علوم و فلسفہ اور تمدن و تہذیب کی بنیادیں، بڑے بڑے سیلابوں اور طوفانوں کے بعد بھی قائم رہیں، اور جدید تہذیب کی عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوئی، سلطنت روما کے عروج کے وقت روم کی جو اخلاقی و اجتماعی حالت تھی، اس کی تصویر ڈریپر ان الفاظ میں کھینچتا ہے:۔

"جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما منتہائے ترقی پر فائز ہوگئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجۂ اخیر کو پہنچ چکی تھی، اہل روما کی عیش پرستی و عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی، اس کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہئے کہ زندگی کو ایک سلسلۂ عیش بنادے پاک بازی، حظ نفس کے خوان نعمت پر بمنزلہ نمکدان ہے، اور اعتدال سلسلۂ حظ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے، ان کے دسترخوان سونے اور چاندی کے باسنوں سے جن پر جواہرات کی پچی کاری ہوتی تھی جھلکتے ہوئے نظر آتے تھے، ان کے ملازم زرق برق کی پوشاکیں پہنے ان کی خدمت کے لئے کمربستہ کھڑے رہتے تھے، ماہرویان روما جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر کی قید سے آزاد تھیں، ان کی مستی انگیز صحبتوں کا لطف دوبالا کرنے کے لئے موجود رہتی تھیں، عالیشان حماموں، دلکشا تماشا گاہوں، اور جوش آفریں دنگلوں سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی وحشی درندوں سے اس وقت تک مصروف زور آزمائی رہتے تھے، جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ کے لئے خاک و خون میں سو نہ جائے، اہل روما کے سامان تعیش پر مزید اضافہ ہوتا تھا، دنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ پرستش کے لائق اگر کوئی شے ہے تو وہ قوت ہے، اس لئے کہ اسی قوت کی بدولت تمام اس سرمایہ کا حاصل کرنا ممکن ہے، جو محنت اور تجارت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے، مال و املاک کی ضبطی، صوبجات کے محاصل کی تشخیص زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے، اور فرمانروائے دولت روما

اس زور و قوت کا نشان یا علامت ہے، غرض روما کے نظام تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی، لیکن یہ جھلک اس نمائشی لمع کی چمک کے مشابہ تھی، جو یونان عہد قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا۔[1]

عرب کا دورِ جاہلیت (جو چھٹی صدی مسیحی میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر ختم ہوتا ہے) اپنے نفسیات، افکار اور اخلاق و اجتماع میں خالص حسّی اور مادہ پرستانہ دور تھا۔ آخرت اور زندگی بعد موت کے تصور سے ان کا ذہن خالی تھا، ان کا خیال تھا (اور یہ خیال حواس پر مبنی تھا) کہ زمین و آسمان کی چکی کے دو پاٹ اور دن رات کا یہ چکر ہم کو پیستا ہے، اس کے سوا کوئی اور طاقت نہیں جو ہماری زندگی کے اس رشتہ کو کاٹ سکے، قرآن ان کے متعلق کہتا ہے:۔

إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ○ (المومنون۔ ۳۷)	انھوں نے کہا کہ محض ہماری دنیا کی زندگی ہی ہے، ہم زندہ ہیں، اور مر جائیں گے، اور مر کر زندہ اٹھائے نہ جائیں گے۔
وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ ۲۴)	انھوں نے کہا کہ دنیا کی زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور زمانہ کے سوا ہم کو کوئی ہلاک کرنے والا نہیں۔

ایک جاہلی شاعر (شدّاخ بن یعمر الکنانی) اسی دلیل پر اپنی قوم کو دوسرے قبیلہ کے خلاف جنگ پر ابھارتا ہے کہ زندہ نہ ان کو ہونا ہے نہ تم کو پھر بزدلی کی کیا وجہ؟ طرز استدلال حسّی نفسیت اور طرزِ فکر کا اچھا نمونہ ہے ۵

[1] معرکۂ مذہب و سائنس ترجمہ مولانا ظفر علی خاں۔

قاتلی القوم یا خزاع ولا | ید خلکم من قتالهم فشل
القوم امثالکم لهم شعر | فی الراس لاینشرون ان قتلوا[1]

(اے قبیلہ خزاعہ حریفوں سے جنگ کرو اور ان سے لڑنے میں بزدلی نہ آنے پائے، یہ (مقابل) لوگ تمہاری ہی طرح ہیں، ان کے بھی سر پر بال ہیں، قتل ہو جانے کے بعد وہ بھی زندہ نہ ہوں گے۔)

انکار آخرت سے زندگی کا جو مادی اور عیش پرستانہ نقطۂ نظر قائم ہوتا ہے، وہ جاہلیت میں بھی تھا، وہ کہتے تھے کہ موت تو برحق ہے، پھر زندگی کے یہ چند دن (جن کے بعد کوئی زندگی نہیں) تشنگی اور محرومی میں کیوں گذریں، تشنہ لب جان دینے سے تو سیراب ہو کر مرنا بہتر ہے، چنانچہ جاہلی نوجوان شاعر طرفہ بن العبد اس ذہنیت کی سچی نمائندگی کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

الا ایہا الزاجری احضر الوغٰی | وان اشہد اللذات ھل انت مخلدی
فان کنت لاتستطیع دفع منیتی | فدعنی ابادرھا بما ملکت یدی
کریم یروّی نفسہ فی حیاتہ | ستعلم ان متنا غدا اینا الصدی[2]

(اے میرے اس بات پر مجھے ملامت کرنے والے کہ میں لڑائی میں شریک ہوتا ہوں اور زندگی کے مزے لوٹتا ہوں ذرا یہ تو بتا کیا تو مجھے ہمیشہ زندہ رکھ سکتا ہے؟)

(پس اگر تو میری موت کو ٹال نہیں سکتا تو مجھے اپنی تمام دولت کے ساتھ اس سے سبقت کرنے دے (کہ میں اس سے پہلے اپنے حوصلے پورے کر لوں)

(میرا گناہ کیا ہے؟ ایک حوصلہ مند آدمی ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے دل کی پیاس بجھاتا

---

[1] حماسہ باب الحماسہ [2] سبعہ معلقہ، معلقہ طرفہ بن العبد۔

ہے کل کو جب ہم مر جائیں گے، یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں کون پیاسا مرا)

ایسے خالص حسی اور جاہلی ماحول میں زندگی کا (عیش و لذت سے) بلند تر مقصد نام و نمود یا اظہار قوت و مردانگی رہ جاتا ہے، جاہلی دماغ اس سے زیادہ بلند پروازی کی طاقت نہیں رکھتا، چنانچہ حوصلہ مند شاعر اپنے سچے جذبات بیان کرتا ہے۔

ولولا ثلاثٌ هُنَّ من عيشة الفتى — وجدِّك لم احفل متى قام عوّدي

فمنهن سبقي العاذلات بشربة — كميت متى ما تعل بالماء تزبد

وتقصير يوم الدجن والدجن معجب — ببهكنة تحت الخباء المعمّد

وكرّي اذا نادى المضاف محنّبا — كسيد الغضا نبهته المتورد[1]

(اگر تین چیزیں نہ ہوتیں جو سرمایہ جوانی ہیں تو تیری قسم مجھے اس کی کوئی پرواہ نہ ہوتی کہ مجھے مرض موت کب پیش آتا ہے)

(ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ ملامت کرنے والی عورتوں سے بھی پہلے اٹھ کر ایک ارغوانی جام چڑھاؤں جس میں اوپر سے پانی ڈالنے کی وجہ سے جھاگ اٹھتا ہے)

(اور ایک خوشگوار بدلی کے دن کو ایک خیمہ کے اندر ایک مہوش کے ساتھ گزار کر مختصر کرتا)

(اور ایک ستم رسیدہ آدمی کی دہائی دینے پر ایسے کج رفتار گھوڑے کو اڑ لگاتا جو غضا کے بھیڑیے کی طرح (پر جوش اور تیز رفتار ہے) جو گھاٹ پر پانی پینے کو جا رہا تھا، اور تم نے اس کو چھیڑ دیا)

ان خیالات کے ساتھ ایک خاص قسم کا جاہلی فلسفہ پیدا ہوتا ہے، اس لئے کہ بداوت اور جہالت کا کوئی ادنیٰ دور بھی بغیر فلسفہ کے نہیں ہوتا، اس فلسفہ میں تمام جاہلی علوم کی طرح

---

[1] سبعہ معلقہ، معلقہ طرفہ بن العبد۔

سطحیت پائی جاتی ہے' ظاہری چیزوں سے استدلال قیاس مع الفارق، حاضر کو غیر موجود پر ترجیح اس کے لوازم میں سے ہے' جاہلی شعراء نے اپنے ان خیالات و جذبات کے ساتھ اس فلسفہ کا بھی اظہار کیا ہے' جو بعض مواقع پر صحیح ہونے کے باوجود اس جاہلی روح اور جاہلی فکر سے خالی نہیں، مثلاً سابق الذکر شاعر طرفہ کہتا ہے کہ احتیاط و بے احتیاطی کا نتیجہ مرنے کے بعد ایک ہے' محتاط اور غیر محتاط آدمیوں کی قبروں کو دیکھو مٹی کے دو ڈھیر ہیں، جن پر پتھر کی کچھ سلیں جوڑ دی گئی ہیں' شاعر اگرچہ مثالاً یہاں بخیل و حریص اور ایک مسرف و عیاش آدمی کا مقابلہ کر رہا ہے مگر دراصل اس کا خیال انہی حدود میں محدود نہیں' وہ کہتا ہے ؎

ارى قبر نحام بخيل بماله   كقبر غوى فى البطالة مفسد

ترى جثوتين من تراب عليهما   صفائح صم من صفيح منضد[1]

(میں ایک بڑے بخیل و حریص آدمی کی قبر اور ایک فریب خوردہ بیکار دولت اڑانے والے اور بگاڑنے والے کی قبر میں کوئی فرق نہیں پاتا، تم کو مٹی کے دو ڈھیر ملیں گے، جن پر مضبوط پتھر کی سلیں جوڑی گئی ہوں گی)

ان نفسی خصوصیات کے ساتھ جاہلیت کی اجتماعی زندگی میں ایک مخصوص قسم کا حسی علم الاخلاق بھی پایا جاتا ہے تقریباً جاہلیت کے ہر دور میں (اگر اس میں خاص تاریخی حالات کے بنا پر زنانہ پن اور تنعم نہ پیدا ہو جائے) دلیری اور جنگجوئی بہترین مردانہ خصائل اور قابل فخریات سمجھی جاتی ہے' خواہ وہ بے مقصد اور بے محل ہو، جنگ بجائے خود بلا کسی بہتر مقصد و نیت اور ضرورت کے مستحسن سمجھی جاتی ہے' اس چیز میں اتنا غلو ہوتا ہے کہ جاہلی قوموں اور قبائل کو جنگ کے بغیر رہنا مشکل ہوتا ہے' ان کو جب کوئی حریف

[1] سبعہ معلقہ طرفۃ بن العبد۔

تو اپنے حلیف ہی پر حملہ کر کے اپنی اس عادت کو برقرار رکھتے ہیں، ایک شاعر قطامی اپنے قبیلہ کے مشغلۂ جنگ کو بڑی صفائی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

واحیانا علی بکر اخینا　　　اذا ما لم نجد الا اخانا

(اور کبھی ہم اپنے برادر قبیلہ بنی بکر ہی پر حملہ کر دیتے ہیں، جب ہم کو اپنے بھائیوں اور حلیفوں کے سوا کوئی نہ ملے۔)

جنگ محض جنگ اور اظہار قوت کے خاطر خاص جاہلی جذبہ ہے، اور یہ جذبہ جتنی تمدن وتہذیب میں اکثر ابھرتا ہے، ایک جاہلی شاعر بڑے پرلطف انداز میں اپنے اس بیتابانہ جذبہ کو ظاہر کرتا ہے کہ جب میرا گھوڑا جوان ہو جائے، اور اس کی پیٹھ سواری کے قابل ہو جائے تو خدا قبائل میں جنگ چھیڑ دے تاکہ مجھے اپنے گھوڑے کے جوہر دکھانے کا موقع ملے ؎

اذا المهرة الشقراء ادرك ظهرها　　　فشب الاله الحرب بين القبائل

واوقد نارا بينهم بضرامها　　　لها وهج للمصطلى غير طائل[۱]

(جب میرے سرخ رنگ کے نوعمر گھوڑے کی پیٹھ سواری کے قابل ہو جائے، تو خدا قبائل کے درمیان جنگ چھیڑ دے، اور اس کی آگ ان کے درمیان بھڑکا دے جس کی آنچ تاپنے والے کے لئے مفید نہیں ہے)

جاہلی قوم میں اگر اتحاد و تعاون بھی ہوتا ہے تو اس کے کچھ شرائط اور حدود نہیں ہوتے، یعنی اس میں معیار حق و باطل نہیں ہوتا، بلکہ محض حمایت کا جذبہ اور جماعتی عصبیت کارفرما ہوتی ہے، یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس طرف بلایا جارہا ہے، اور کس چیز مدد مانگی جارہی ہے، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون بلا رہا ہے، اور کون مدد

؎ حماسہ باب الحماسہ　　[۱] ایضاً

مانگ رہا ہے، اس حمیت جاہلیت کو یہ مقبول عام جملہ خوب ادا کرتا ہے۔ ع

انصر اخاک ظالما او مظلوما[1]

(اپنے بھائی کی ہر حال میں مدد کرو خواہ ظالم ہو خواہ مظلوم)

جاہلی شاعر کہتا ہے ؎

ان انا لم انصر اخی وھو ظالم علی القوم لم انصر اخی حین یظلم

(اگر میں نے اپنے بھائی کی ظالم ہونے کی حالت میں مدد نہ کی تو میں اس کی مظلوم ہونے کی حالت میں بھی کیا خاک مدد کروں گا۔)

یہ حسّی اور مادی تمدن چونکہ دنیا کا سب سے عام اور مقبول تمدن ہے، اس لئے اس کے خدوخال پیش کرنے میں ذرا تفصیل سے کام لیا گیا۔

عقلی تمدن[2]

تمدن و تہذیب کی طویل تاریخ میں ہمیں کسی ایسے تمدن کا علم نہیں جس کو خالص عقلی تمدن کہنا صحیح ہو، اور جس میں کوئی چیز اس وقت تک اختیار نہ کی جاتی ہو جب تک عقل کی کسوٹی پر کس کر دیکھ نہ لی جائے اور عقل اس کے جواز یا استحسان کا فیصلہ نہ کر دے ایسا تمدن اگر وجود میں آ بھی جائے تو لوگوں کی زندگی دشوار ہو جائے

---

[1] حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں مشہور امام لغت مفضل ضبّیؒ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جاہلیت میں سب سے پہلے جس نے یہ جملہ کہا وہ جندب بن عنبر ہے، اس سے مراد بالکل اس کا ظاہری لفظی مفہوم ہے۔

[2] یہ عقلی تمدن بھی جیسا کہ آگے واضح کر دیا گیا ہے، دراصل حسّی اور مادی تمدن ہی ہے لیکن چونکہ اس کے متعلق عقلی ہونے کی عام غلط فہمی ہے، اس لئے ہم نے اس کو علیحدہ اس عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔

اور خود اس تمدن کا دن دو دن سے زیادہ جینا مشکل ہو، بقول ایک مغربی ادیب کے "انسان اپنی زندگی اور اپنے افعال میں بہ نسبت عاقل کے غیر عاقل زیادہ ہے" تمدن کے متعلق بھی یہ کہنا صحیح ہوگا، نظریات وافکار، عقائد وخیالات، رسوم وعادات، اصول معاشرت، اخلاق وتہذیب کسی کے متعلق یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے کہ ان کی بنیاد عقل خالص پر ہے، اور عقل ان کے رد وقبول کا معیار کامل ہے، ان میں سے اکثر چیزیں عقل سے مشورہ لئے بغیر وجود میں آجاتی ہیں، پھر عقل کا فیصلہ ان کے حق میں غیر مسموع ہوتا ہے یا عقل خود ان کو سند جواز دے دیتی ہے، اور ان کی طرف سے وکیل بن جاتی ہے، یونان کے پیشہ عصمت فروشی اور خلاف فطرت جرائم کی یونانی عقل نے کیا کیا صفائیاں پیش نہیں کیں اور کیسے کیسے نکتے نہیں نکالے، سپاہی کی تصریحات کے لئے جس سے بڑھ کر خون آشامی اور شقاوت کا فعل نہیں ہوسکتا، رومی عقل نے کیا کیا تاویلیں نہیں کیں اور اس کی معصومیت پر کیسے کیسے دلائل قائم نہیں کئے، جاہلیت عرب کی رسم دختر کشی اور ہندوستان کی ستی کی رسم کے متعلق اس وقت کے عقلا کیا کیا فلسفے بیان نہیں کرتے ہوں گے، لیکن اس سے حقائق اشیا تبدیل تو نہیں ہوجاتے اور وہ تمدن عقلی تو نہیں کہلایا جاسکتا۔

تمدن واجتماع تو بعد کی چیزیں ہیں، ان کے خمیر میں تو عقل کے علاوہ اور بہت سی چیزیں داخل ہیں، حکمت وفلسفہ بھی غیر عقلی عناصر سے پاک نہیں۔

یونان کے فلسفہ میں جو عقل انسانی کا جوہر سمجھا جاتا ہے، یونانیوں کے علم الاصنام (MYTHOLOGY) اور یونانی توہمات اور افسانوی اعتقادات کا کتنا بڑا حصہ ہے، افلاطون وارسطو بھی اپنی "مسلم" حریت فکر کے باوجود اپنے ماحول کے اثرات اور

مسلمات سے آزاد نہ ہو سکے۔

دنیا کے جن تمدنوں کو پہلی اور سطحی نظر میں عقلی اور علمی تمدن سمجھا جاتا ہے، گہری اور تنقیدی نظر کے بعد وہ خالص حسّی اور مادی تمدن ثابت ہوتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ فریب یورپ کے موجودہ تمدن کا ہے، جو یورپ کے ساحرانہ پروپیگنڈے سے انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ عقلی اور علمی تمدن تسلیم کیا جاتا ہے، حالانکہ فلسفۂ جدید کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کی تاریخ ہی عقلیت کے خلاف.... حسیت اور تجربیت کی بغاوت سے شروع ہوتی ہے، اور اس کا انجام عقل پر مادہ، روح پر حواس اور اعتقاد پر تجربہ کے انتہائی غلبہ اور فتحمندی کی صورت میں ظاہر ہوا، سترہویں صدی عیسوی سے یورپ کے فلاسفہ و حکما، اجتماعیین و اخلاقیین نے عقل کے خلاف جنگ عظیم شروع کی، انھوں نے نقارہ کی چوٹ پر کہا کہ حقائق میں سے جو چیز تجربہ میں نہ آسکے، موجودات میں سے جو چیز ناپی، تولی اور گنی نہ جا سکے، اخلاق میں سے جس چیز کا فائدہ ظاہر نہ ہو وہ قابل تسلیم نہیں ہے، انھوں نے بالاعلان اس کی دعوت دی کہ کائنات پر غور آزادانہ طریقہ پر ہو جس کی بنیاد کسی مابعد الطبیعی نظریہ یا کسی مافوق البشر ہستی کے وجود پر نہ ہو، انھوں نے مادہ اور حرکت کے علاوہ کسی اور طاقت کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، اور صاف صاف کہہ دیا کہ اس عالم میں کوئی نفسی یا روحی یا عقلی قوت کام نہیں کر رہی ہے، کائنات کی میکانکی توجیہہ ہی مدلل اور علمی طریقہ قرار پایا، اور اس کے علاوہ ہر توجیہہ ہر طریق فکر ہر طرز استدلال غیر معقول اور غیر علمی ٹھیرا، رفتہ رفتہ یہ طبیعت، یہ میکانکی ذہنیت اور یہ تجربیت و افادیت ساری زندگی پر چھا گئی۔

اخلاق و معاشرت، سیاست و اجتماع سب کی بنیاد ہی تجربہ اور افادہ قرار

پایا، اور زندگی کا کوئی مخفی گوشہ تقلب و دماغ کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ریشہ بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ کے لٹریچر میں جس قدر عقل اور فطرت کے الفاظ کا استعمال ہوا ہے، شاید کسی لفظ کا نہیں ہوا، اور یہ دونوں الفاظ یورپ کے لئے جو کشش اور ان کے دماغوں پر جو اثر رکھتے ہیں، وہ اثر کم الفاظ کو حاصل ہوگا، لیکن ان الفاظ کی تحقیق کیجئے گا، اور زندگی میں ان کی تشریحات دیکھئے گا تو ثابت ہوگا کہ عقل سے ان کی مراد عقل حیوانی ہے (اگر یہ تعبیر صحیح ہو) جو محسوسات اور تجربہ کی پابند ہے اور جس کے نزدیک ان دو کے علاوہ ہر چیز بے حقیقت اور خلاف عقل ہے، سترہویں صدی کا ایک عالم اس خیال کی اس طرح ترجمانی کرتا ہے:۔

> "ہمارے علم کے نتائج صرف ریاضی کے ذریعہ سے پوری طرح یقینی ہو سکتے ہیں، عقل تجربہ کا ماحصل ہے لہذا زمانہ کی پیداوار ہے وہ تمام تخیلات قابل رد ہیں، جن کی تائید تجربہ سے نہیں ہوتی کیونکہ تجربہ ہی تمام علوم کی ماں ہے"۔[1]

اسی طرح فطرت سے مراد فطرت حیوانی ہوتی ہے، جو ہر قسم کے لطیف احساسات، اخلاقی ضمیر، اور قلب سلیم اور عقل سلیم دونوں سے آزاد ہوتی ہے، جو ہر قسم کی پابندیوں اور حدود سے گھبراتی ہے، جس کا تقاضا صرف یہ ہے کہ انسان کھائے، پیئے اور آزاد رہے، چنانچہ جن چیزوں کے مقابلہ میں اور جن مواقع پر یہ لفظ بولا جاتا ہے، ان سے صاف تعیین ہوتی ہے کہ اس سے فطرتِ بہیمی کے علاوہ اور کچھ مراد نہیں۔

---

[1] لیو نارڈو (LEONARDO) تاریخ فلسفہ جدید از ڈاکٹر ہرلڈ ہوفڈنگ (HEROLD HOFF DRING) ص ۱۶۵

حسّی تمدن اور علم میں انسان کے ایک ترقی یافتہ حیوان ہونے کا اجمالی اور سرسری تخیل ہوتا ہے، یورپ کے تحقیقی اور علمی دور میں وہ ایک مفصل و مدلل علمی (سائنٹفک) حقیقت بن گیا، اور یہ نظریہ ساری زندگی کے جسم میں روح کی طرح سرایت کر گیا، انسان کی سعادت اسی میں سمجھی جانے لگی کہ وہ اپنی اصل اور فطرت سے قریب تر ہو۔

اس کا فطری اقتضا یہ ہوا کہ انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ اور کمال مطلوب لذت و تمتع (ENJOYMENT) قرار پایا، ایرانی شاعر نے جس مقصد کو "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی شاعرانہ زبان میں ادا کیا تھا، عربی شاعر نے جس کو اس لطافت سے کہا تھا ؎

کریم یروّی نفسہ فی حیاتہ   ستعلم ان متنا غدًا اینا الصدی

(میرا گناہ کیا ہے؟ ایک حوصلہ مند آدمی ہوں، جو اپنی زندگی میں اپنے دل کی پیاس بجھاتا ہے، کل کو جب ہم مر جائیں گے، یہ معلوم ہو جائیگا کہ ہم میں کون پیاسا مرا)

اور ہندوستانی شاعر نے جس کو زندگی کی بے ثباتی کے پردہ میں یوں بیان کیا تھا ؎

ساقی ہے ایک تبسم گل فرصت بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

مغرب کی حقیقت پسند اور صاف گو زبان نے استعارات و کنایات کا پردہ اٹھا کر اور اس کے ہجے کر کے صاف صاف یوں کہا (EAT AND DRINK AND BE MARRY)

"کھاؤ پیو اور مست رہو۔"

یہی مادّی اور خود غرضانہ ذہنیت زندگی کے تمام شعبوں میں جلوہ گر ہوئی، معاشیات میں اس نے سرمایہ داری کی شکل اختیار کی، سیاست میں اس نے ملک گیری اور اقتدار کا رنگ اختیار کیا، نظریات و افکار میں بھی دو مقابل پہلوؤں میں سے مغرب نے اسی پہلو کو اختیار

کیا، جو زیادہ حسّی اور مادی تھا، مثلاً مذہب یا وحدت خیال کی بنا پر جو بین الاقوامی اتحاد ممکن ہے، اس کے مقابلہ میں ایک قومیت یا ایک نسل، یا ایک وطنیت کی بنا پر اتحاد زیادہ حسّی اور مادی ہے، اور حواس کے لئے اس میں زیادہ کشش ہے، چنانچہ یورپ کا انتخاب بین الاقوامیت اور انسانیت کے مقابلہ میں قومیت، اور تمام روئے زمین کو اپنا وطن سمجھنے کے بجائے محدود جغرافیائی وطنیت تھا، مغرب میں دین کا اثر جتنا کمزور ہوتا گیا، اور حسیت اور مادیت کا جتنا غلبہ ہوتا گیا، قومیت اور وطنیت کا جذبہ اتنا ہی قوی ہوتا گیا، گویا یہ دونوں ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں کہ ایک جتنا جھکتا ہے دوسرا اتنا ہی اونچا ہو جاتا ہے۔

یورپ کے جدید لٹریچر میں روحانیت (SPIRITUALISM) کا لفظ بھی کافی دلچسپی کے ساتھ آتا ہے، لیکن اس سے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ وہ کوئی روحانی تحریک اور تزکیہ نفس اور صفائی قلب کا کوئی نظام ہے، یہ محض انسان کی چند مخفی طاقتوں کی پرورش و ترقی اور ان کے عجائب اور شعبدوں کا مظاہرہ ہے، جو مسمریزم کی طرح ایک مرتب فن (SCIENCE) اور ایک صنعت (ART) بن گیا ہے، اور جس کا اخلاق اور خود روح پر کوئی اثر نہیں۔

یورپ پورا کا پورا لفظاً لامذہب بھی نہیں، اس کا بڑا حصہ مذہباً عیسائی ہے، لوگ اتوار کے دن چرچ میں جمع ہوتے ہیں، مسیحی رسوم و تقریبات ملک میں شان و شوکت کے ساتھ منائی جاتی ہیں، اور مذہب کے بہت سے مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن درحقیقت یورپ کا مذہب صرف مادہ پرستی ہے۔

ایک صحیح الفکر مسلمان یوروپین[1] یورپ کی موجودہ زندگی اور اس کی مادہ پرستی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

---

[1] محمد اسد صاحب سابق (LEOPOLD WEISS)

"متوسط یورپین خواہ وہ جمہوری ہو یا فاشستی سرمایہ دار ہو یا اشتراکی صناع اور دستکار ہو یا دماغی کام کرنے والا صرف ایک اثباتی مذہب جانتا ہے مادی ترقی کی پرستش اور یہ یقین کہ زندگی کا مقصد وحید زندگی کو مسلسل آسان سے آسان تر اور (جدید تعبیر کے مطابق) "فطرت سے آزاد" بنانا ہے اس مذہب کے معبد عظیم الشان کارخانے سینما کیمیاوی معمل ناچ گھر اور بجلی کے کارخانے ہیں اور اس مذہب کے پادری بینکر انجینیر فلم اسٹار ملک التجار اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں قوت اور مسرت کے اس حصول پن کا لازمی نتیجہ وہ حریف گروہ اور جماعتیں ہیں جو کیل کانٹوں سے لیس اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لئے تیار ہیں جب بھی ان کا مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے تہذیبی نقطہ نگاہ سے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں کی ایک ایسی قطع پیدا ہو گئی ہے جس کی اخلاقیت عملی افادیت کے سوال کے اندر محصور ہے اور جس کے نزدیک خیر و شر کا بلند ترین معیار مادی کامیابی ہے مغرب کی معاشرتی زندگی موجودہ زمانہ میں جس گہری تبدیلی سے گزر رہی ہے اس میں نئی اخلاقی افادیت روز بروز زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتی جا رہی ہے وہ تمام محاسن جو سوسائٹی کے مادی مفاد پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں، مثلاً صنعتی قابلیت وطن پرستی قوم پرستانہ احساس جماعت ان کی عظمت بڑھتی جا رہی ہے اور ان کی قیمت میں بعض اوقات غیر معقول طریقہ پر مبالغہ کیا جاتا ہے اس کے مقابلہ میں وہ محاسن جن کی ابھی تک محض اخلاقی حیثیت سے قیمت تھی، مثلاً محبت پدری، یا ازدواجی وفاداری، وہ بڑی سرعت کے ساتھ

اپنی اہمیت کھو رہے ہیں، اس لئے کہ وہ سوسائٹی کو کوئی نمایاں مادی فائدہ نہیں پہنچاتے، اس زمانہ کی جگہ جس میں خاندانی روابط کا استحکام ہی خاندان اور قبیلہ کی خیر و فلاح کے لئے ضروری تصور کیا جاتا تھا، مغرب جدید میں اس زمانہ نے لے لی ہے، جو وسیع تر عنوانات کے ماتحت اجتماعی تنظیم کرتا ہے، ایک ایسی سوسائٹی میں جو بنیادی طور پر صنعتی ہے، اور جس کی تنظیم بڑی تیز رفتاری کے ساتھ خالص میکانکی خطوط پر کی جا رہی ہے، ایک فرد کا برتاؤ اپنے والد کے ساتھ کوئی معاشرتی اہمیت نہیں رکھتا، جب تک کہ یہ افراد اس عام معیار شرافت کے حدود کے اندر ایک دوسرے سے برتاؤ کرتے ہیں، جو سوسائٹی نے افراد کے باہمی برتاؤ کے لئے مقرر کر دیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپین باپ کا اقتدار اپنے بیٹے پر برابر کم ہوتا جا رہا ہے، اور بیٹے کے دل میں اپنے باپ کی طرف سے عزت و احترام کا جذبہ روبزوال ہے، ان دونوں کے باہمی تعلقات تیزی کے ساتھ قابو سے باہر ہوتے جاتے ہیں، اور عملاً ایک ایسی مشینی سوسائٹی کے ذریعہ ان تعلقات کا خون ہو رہا ہے، جس میں افراد کے حقوق باہمی کے منسوخ کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے، اور جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خاندانی رشتہ داری کے پیدا کئے ہوئے حقوق بھی ختم ہوتے جاتے ہیں![1]

اشراقی تمدن

اشراق حواس پرستی اور مادیت کا بالکل ضد ہے، حواس پرستی میں جس طرح

---

[1] ISLAM AT THE CROSS ROADS, LAHORE (1963) pp. 55-58

روح اور اس کے متعلقات کا انکار ہے، یا ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے، اشراق میں جسم اور مادیت کے خلاف جنگ کی جاتی ہے، اس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ انسان کا جسم ایک قفس ہے، جس میں طائر روح مقید ہے، وہ قفس اس کی ہر قسم کی ترقی اور پرواز میں حائل ہے، روح اپنے مرکز اصلی اور سرچشمۂ حقیقت سے اس وقت تک اتصال پیدا نہیں کر سکتی، جب تک کہ اس قفس سے آزاد نہ ہو، اس لئے یا تو اس قفس کو توڑ دیا جائے یا اس کی تیلیوں کو اتنا کمزور کر دیا جائے کہ طائر روح جب چاہے آزادانہ اپنے آشیانہ کی طرف پرواز کرے۔

اشراقیتِ جدیدہ کا دوسرا امام پار فری کہتا ہے کہ فلسفہ کی غایت موت کا حصول وقرب ہے، اس لئے کہ اس سے جسم و روح کا انفصال حاصل ہوتا ہے، جو زندگی کا اصلی مقصود ہے، اسی مذہب کے دوسرے ائمہ کہتے ہیں کہ:۔

> "انسان کے لئے سب سے بڑی مصیبت لذت و مسرت ہے کہ اسی کے باعث روح کو جسم سے وابستگی اور دلچسپی قائم ہو جاتی ہے، اور اسی کے باعث روح کا عنصر یزدانیت ماند پڑ جاتا ہے، اور وہ روح حقیقت کو چھوڑ کر جسم کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے لگتی ہے، فلسفہ کی تحصیل حواس ظاہری کو مردہ کرنے کے بعد صرف خالص و بے آمیز عقل کی بنا پر ہونا ممکن ہے، جسم روح کو گمراہ کرتا رہتا ہے، اور جب تک روح قید مادی میں گرفتار رہے، ہم کبھی حقائق اصلی کو نہیں پا سکتے۔"

اس اشراقی فلسفہ اور تعلیم کا اثر جن مذاہب اور اخلاقیات پر پڑا ان میں جسم کی تعذیب، مادیت کا ازالہ، محض خواہشاتِ انسانی کا استیصال کلی، جذبات کشی، تجرد و رہبانیت اصول و فرائض میں شامل ہو گئے، اور اصولی طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ جسمانیت و روحانیت

دو اضداد ہیں جن کا اجتماع محال ہے، اور انسان کی سعادت اس میں ہے کہ وہ روح کے مقابلے میں جسم کو بالکل مغلوب اور نظر انداز کر دے۔

اس فلسفہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جسم اور اس کے متعلقات سے نہ صرف غفلت برتی جاتی ہے، بلکہ اس کے خلاف ایسا معاندانہ جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو کسی راہ رو کو ایسے پتھر کے مقابلہ میں پیدا ہوتا ہے، جس سے اس نے بار بار ٹھوکر کھائی ہو، یا ایک مہجور آشیاں طائر کے دل میں اپنے قفس کے خلاف پیدا ہوتا ہے، دنیا کو دار العذاب، زندگی کو ایک بار گراں اور دنیاوی تعلقات کو طوق و سلاسل سمجھا جانے لگتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ تصورات تمدن کی بنیادوں پر تیشہ کا کام دیتے ہیں، اور ان سے کسی تمدن کی تخریب کا تو بخوبی کام لیا جا سکتا ہے، لیکن کسی تمدن کی تعمیر کا کام قطعاً نہیں لیا جا سکتا۔ حسیت و روحانیت خالصہ دو انتہائی سروں پر ہیں، لیکن ان دونوں میں یہ ایک بڑا فرق ہے کہ حسیت دنیا میں اپنے اصول پر تمدن قائم کرنے میں آسانی سے کامیاب ہو جاتی ہے، لیکن روحانیت خالصہ کے فلسفہ پر کسی محدود سے محدود قطعہ زمین میں بھی کوئی تمدنی زندگی ظہور میں نہیں آسکتی۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ فلسفۂ اشراق کے قبول کرنے والوں نے خارجی زندگی میں اشراقی اور روحانی اصول سے بالکل ہٹ کر مادّی اور حسی اصول پر اپنی زندگی گزاری، ان کو اپنی زندگی میں روحانیت اور مادیت کے درمیان پیوند لگانا پڑا، وہ اپنی عبادت گاہوں میں اشراقی اور روحانی تھے، لیکن بساطِ سیاست پر خالص مادّی اور حسّی تھے، اشوک جو ایک عقیدت مند اور پرجوش بدھ تھا، اور ساتھ ہی ساتھ ایک زبردست فرماں روا اور کامیاب فاتح تھا، اس طرزِ عمل کا ایک نمونہ ہے، قسطنطین نے جب مسیحیت (جو اپنے علمبرداروں کے ہاتھوں مسخ ہو کر ایک خالص روحانی اور اشراقی تعلیم بن چکی تھی) قبول کی تو اس نے بھی یہی

"دو عملی" اختیار کی اور مسیحیت کی روحانیت کے ساتھ بت پرست قوم کی مادیت اور جاہلیت کو جمع کیا۔

مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا بلکہ جب کسی خالص روحانی تعلیم کو تمدن پر اثر انداز ہونے کا موقع مل جاتا ہے تو تمدن کو برابر زوال ہوتا جاتا ہے، اور قوم و تہذیب پر رفتہ رفتہ عالم نزاع طاری ہو جاتا ہے، اس وقت یا تو وہ قوم اور تہذیب صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے، یا اگر اس قوم میں مدافعت کی کچھ طاقت ہوتی ہے تو اس روحانیت خالصہ کے خلاف ایک زبردست ردعمل شروع ہوتا ہے، جو بالعموم مادیت محضہ سے کم پر قناعت نہیں کرتا اور روحانیت کی کسی شکل کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت یا رواداری روا نہیں رکھتا، یہ آخر الذکر صورت یورپ میں پیش آئی، جہاں اولاً اشراقیت کے اثر اور ثانیاً مذہب عیسوی کے نمائندوں اور علمبرداروں کی کج فہمی اور حقیقت مذہب سے ناآشنائی اور مسخ و تحریف سے کچھ دنوں کے بعد مسیحی مذہب اشراقیت سے بھی زیادہ راہبانہ اور غیر فطری نظام بن گیا، ازدواج کو معصیت کبیرہ طبقہ اناث کے وجود کو دنیا کے لئے لعنت اور اس سے تعلق کو دینی ترقی میں سب سے بڑا مانع سمجھنے کا اعتقاد اصول مذہب میں داخل ہو گیا، اور اچھے اچھے متبحر علماء مسیحیت نے علانیہ تجرد و رہبانیت کی تبلیغ کی، قرون وسطے کے بڑے بڑے مشہور راہب اور علماء بچوں کو ماؤں کی گود سے نکال کر صحرا میں پہنچانے اور لڑکوں کو اغوا کر کے راہب بنانے کا کام فخریہ انجام دیتے تھے، جسم کشی، خود آزاری اور خلاف فطرت ریاضتوں کے جو لرزہ خیز واقعات اور راہبوں کے وحشی درندوں کے غاروں، خشک کنوؤں اور قبرستانوں میں رہنے، ستر پوشی کا کام جسم کے بڑے بڑے بالوں سے لینے چوپایوں کی طرح ہاتھ پیر کے بل چلنے، انسانی خوراک کے بجائے گھانس کھانے، سال سال بھر ایک پاؤں سے کھڑے رہنے کی جو روایات لیکی نے "تاریخ اخلاق یورپ" میں نقل کی ہیں، ان سے ان بے اعتدالیوں کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، جو مسخ شدہ

مسیحیت نے انسانیت و تمدن کے حق میں کیں تھیں۔

اس آدم بیزار اور مردم آزار نظام روحانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسوی سلطنت اور مذہب کا جہاں جہاں اثر تھا، تمدن کی بنیادیں ہل گئیں، ملک کی آبادی سرعت کے ساتھ گھٹنے لگی، امراض، موتوں اور قحط سالیوں کی کثرت ہوئی، تعلیم فنا ہونے لگی، شہریت کے آثار مفقود ہونے لگے، وسائل حیات برائے نام رہ گئے اور پوری مسیحی دنیا میں جہالت، وحشت اور تاریکی کا دور دورہ ہو گیا، یہاں تک کہ "قرونِ وسطیٰ" "قرونِ مظلمہ" کا ہم معنی قرار پائیں۔

اس صورتِ حال کے خلاف ردعمل ہونا بالکل طبعی امر تھا، یہ ردعمل ہوا، اور جب انیسویں صدی میں روحانیت اور رہبانیت نے آخری شکست کھائی تو جدید یورپ مادیت پر اس طرح گرا جس طرح کوئی فاقہ زدہ اور "ندیدہ" انسان کھانے پر گرتا ہے، یہ مادیت اس ظلم کا انتقام تھا، جو مسیحی راہبوں اور ارباب کلیسا نے کئی سو برس تک انسانیت اور تمدن پر روا رکھا تھا، لیکن یہ انسانیت پر ایک دوسرا ظلم تھا، اور اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سا بڑا ظلم ہے، اور کس میں جوہر انسانیت کی زیادہ ناقدری ہے، یہ پیشگوئی بھی مشکل ہے کہ اس بہیمانہ بلکہ درندوں کی مادیت اور اس میکانیکی جمادات کے خلاف ردعمل کب ہوگا، اور وہ کہاں جا کر رکے گا۔!

سوالات کے جواب کی دوسری راہ

رسالت

اس ساری بحث و تنقیح کا حاصل جس نے آپ کا اتنا وقت لیا یہ ہے کہ انسان کی تمام ظاہری اور باطنی قوتیں، اس کے حواس، اس کی عقل اور اس کا حاسّۂ باطنی، اس کا مشاہدۂ باطنی، سب اس کے ان اہم اور بنیادی سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہیں، اور انسان نے اپنی پوری تاریخ میں ان قوتوں کے ذریعے جب ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی تو وہ ناکام رہا، اور ان مشتبہ اور قیاسی جوابات اور مفروضات پر جب اس نے اپنی زندگی اور تمدن کی کوئی عمارت بنائی تو اس کی بنیاد میں کوئی ایسی کجی پیدا ہو گئی جس سے اس کی دیوار ثریا تک کج رہی۔

لیکن کیا ہم اس سلبی نتیجہ پر قانع ہو سکتے ہیں، اور کیا ہم کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ درحقیقت ان سوالات کا جواب موجود ہی نہیں؟

ہم جب کائنات پر نظر ڈالتے ہیں، اس کی وسعت، اس کی عظمت، اس کی صنعت اور حکمت، اس کے قوانین کی ہمہ گیری، اس کے عناصر کا اعتدال، اس کے اجزا کا تناسب اور ان کا باہمی تعاون دیکھتے ہیں تو ہماری عقل سلیم یہ فرض کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی، کہ یہ کارخانہ بغیر کسی بنانے والے کے بن گیا، بغیر کسی چلانے والے

کے چل رہا ہے، کوئی مقصد اور غرض وغایت نہیں رکھتا اور یوں ہی خود بخود ختم ہو جائے گا۔

اسی طرح ہم جب اس عظیم الشان اہتمام کو دیکھتے ہیں، جو پیدائش سے موت تک انسان کے لئے اس دنیا میں کیا گیا ہے، ان وسیع انتظامات کو دیکھتے ہیں، جو انسان کے لئے قدم قدم پر موجود ہیں، اس مرکزیت اور مقصودیت کو دیکھتے ہیں، جو انسان کو زمین کی اس بساط پر حاصل ہے، اس وافر سامان کا جائزہ لیتے ہیں، جو اس کی زندگی کے ایک ایک شعبہ کی تکمیل اور اس کی فطرت کے مخفی سے مخفی مطالبہ کی تعمیل کے لئے زمین کے اس فرش پر پھیلا ہوا ہے، اس رہبری اور رہنمائی کا مشاہدہ کرتے ہیں، جو اس کی زندگی کے ہر موڑ پر اس کے لئے موجود ہے، تو ہماری عقل باور نہیں کرتی کہ اس مہتم بالشان انسان کی زندگی بھی بے مقصد ہے، وہ جانوروں اور حشرات الارض کی سطح سے بلند نہیں، اور یہ کہ اس کے لئے ان اصولی اور زندگی کے مرکزی سوالات کے بارے میں کسی رہبری اور رہنمائی کا انتظام نہیں، اور اس کے شعبۂ روحانی کی تکمیل کا کوئی سامان نہیں۔

پھر ہم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو نظر آتا ہے کہ وہ انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے مکمل ہے، اس کے اجزا ایک دوسرے سے مل کر یہ مجموعہ بناتے ہیں، جو ہر طرح مکمل ہے، ان میں سے کوئی ایک جز کی قائم مقامی نہیں کر سکتا، انسانی نظام بھی اسی تعاون اور اسی تقسیم عمل پر مبنی ہے۔

اب ہم اس ذہنی نقطہ پر ہوتے ہیں کہ ہم کو ایک طرف بطور خود ان مسائل کے حل کرنے کے بارے میں اپنا عجز تسلیم ہے، دوسری طرف ہمیں اس کا ادراک ہے کہ ان مسائل میں ہماری رہنمائی کے لئے خدا کی طرف سے انتظام ہونا چاہئے، ساتھ ہی

ساتھ ہمیں اس پر اصرار نہیں کہ انسانوں کا ہر فرد اس رہنمائی کے قابل ہو، اس لئے کہ یہ خالق کائنات کی سنت اور اس عالم کی فطرت کے خلاف ہے۔

انبیاء کرام

اس موقع پر ہمارے سامنے ایسے انسان آتے ہیں، جن کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ان مسائل میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس حکیم کائنات نے اس عالم کے بہت سے اسرار ہم پر فاش کئے ہیں، اور ایک نیا عالم (عالم غیب[1]) ہم پر منکشف کیا، جس کو جب وہ ہمیں دکھاتا ہے، اسی طرح دیکھتے ہیں، جس طرح تم اس عالم (عالم شہود) کو دیکھتے ہو، اس نے ہم کو اپنے دلی منشا، پسندیدگی اور ناپسندیدگی اور احکام کا براہ راست علم بخشا، اپنے اور تمہارے درمیان ہمیں واسطہ بنایا اور ہم پر اپنا کلام نازل کیا، یہ انبیاء کرام کا گروہ ہے۔

ان دعویٰ کرنے والے انسانوں کے متعلق بطور خود ہم کو چند اور باتوں کا علم ہوتا ہے۔

(۱) ان کے اخلاق نہایت بلند، ان کی سیرت بالکل بے داغ اور ان کی زندگی بالکل غیر مشتبہ ہے، کسی ادنیٰ سے ادنیٰ معاملہ میں ان کے متعلق کبھی جھوٹ اور غلط بیانی کا تجربہ نہیں ہوا، اور کبھی انھوں نے کسی معاملہ میں کسی کو دھوکا نہیں دیا۔[2]

---

[1] غیب اصطلاح میں اس حقیقت کو کہتے ہیں جس کا مجرد حواس یا عقل خالص سے ادراک نہ کیا جا سکے۔ [2] پیغمبر اپنی قوم سے کہتا ہے "فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ" (سورہ یونس ۱۶) (میں تمہارے لئے کوئی نیا اور اجنبی انسان نہیں ہوں) ایک اچھی خاصی عمر (باقی ص۶۹ پر)

(۲) وہ نہایت کامل العقل، صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت انسان ہیں، جو تمام معاملات میں صائب رائے، معتدل اور متوازن فہم رکھتے ہیں، اور ان سے کبھی کوئی ایسی چیز سرزد نہیں ہوئی جس سے ان کی صحت عقل، ہوشمندی اور توازن دماغی پر شبہ ہو۔[۱]

(۳) وہ دنیا کے تمام معاملات میں (ان مسائل کے علاوہ) متوسط درجہ کے انسان اور معتدل سیرت کے لوگ ہوتے ہیں، جن کو دوسرے دنیاوی مسائل اور علوم میں کسی امتیاز و تفوق اور مہارت خصوصی کا دعوی نہیں ہوتا۔[۲]

(باقی ص۶۷ کا) اس دعویٰ سے پہلے میں نے تم میں بسر کی ہے (تم نے مجھے اچھی طرح دیکھا بھالا ہے، کیا کبھی میں جھوٹ بولا، کیا کبھی میں نے تمہیں دھوکا دیا، اب دفعتہً مجھے کیا ہو گیا کہ یہ اتنا بڑا جھوٹ بولوں اور تمہیں اتنا بڑا فریب دوں)۔

[۱] "مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ" (سورۂ قلم ۲) (تم اپنے رب کے فضل سے کوئی دیوانے نہیں ہو) "قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ" (سبا ۴۶) (کہو کہ میں تمہیں ایک بات کا مشورہ دیتا ہوں کہ خدا کے لئے دو دو کر کے اور فرداً فرداً کھڑے ہو اور غور کرو کہ تمہارے اس رفیق (پیغمبر) کو کوئی سودا نہیں۔)

[۲] "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ" (سورہ کہف ۔ ۱۱۰) (کہو میں تمہیں جیسا ایک انسان ہوں، مجھ میں اور تم میں جو فرق ہے، وہ محض وحی کا ہے) "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى" (سورہ یوسف ۔ ۱۰۹) (اور ہم نے تم سے پہلے بستیوں کے رہنے والوں میں سے مرد ہی بھیجے تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے)

(۴) وہ ان علمی مسائل میں ایسے معلومات کا اظہار کرتے ہیں، جن کا ماخذ بداہتہً وہ علوم نہیں معلوم ہوتے، جو ان کے معاصر انسانوں کے پاس ہوتے ہیں[۱]، وہ اکثر اپنے زمانے کے اصطلاحی علوم سے ناواقف ہوتے ہیں[۲]، وہ علوم وفنون کی اصطلاحی زبان استعمال نہیں کرتے، ہر قسم کے تکلف وتصنع سے پاک ہوتے ہیں[۳]، حقیقت کا چشمہ جس طرح ان کے دل پر گرتا ہے، اسی طرح ان کی زبانوں سے رواں ہوجاتا ہے[۴]۔

---

[۱] تِلْكَ مِنْ اَنْبَاۤءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (سورہ ہود۔۴۹) (یہ غیب کی خبریں ہیں جن کو ہم وحی کے ذریعہ تم پر بھیجتے ہیں، نہ تم ان کو جانتے تھے پہلے اور نہ تمہاری قوم۔)

[۲] وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (سورہ عنکبوت۔۴۸) (تم نبوت سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے، اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو اہل باطل کو شک کرنے کا موقع تھا۔)

[۳] وَ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِیْنَ (سورہ ص۔۸۶) (میں تصنع سے بالکل کام نہیں لیتا۔)

[۴] وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى (سورہ النجم ۳۔۴)
(وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا وہ محض وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔)
قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ (سورہ یونس۔۱۵) (کہو مجھے یہ حق نہیں کہ میں اس کو اپنی طبیعت سے بدل دوں میں تو اس کی پیروی کرتا ہوں، جو میری طرف وحی کے ذریعے بھیجا جاتا ہے۔)

(۵) وہ ایک عرصہ تک کوئی دعویٰ نہیں کرتے نہ دوسروں کو یہ امید ہوتی ہے[۱]، اور نہ خود ان کو توقع ہوتی ہے، کہ وہ مستقبل میں اس منصب سے سرفراز کیئے جانے والے ہیں[۲]۔

(۶) وہ ابتدا ہی سے اخلاقی طور پر ممتاز اور اخلاقی کمزوریوں سے محفوظ ہوتے ہیں، اور سلامت فطرت کا مکمل نمونہ ان میں نظر آتا ہے[۳]۔

(۷) ان کے علم میں دنیا کے علوم کی طرح تدریج نہیں ہوتی، ان پر حق دفعۃً اور کاملاً منکشف ہوتا ہے، عمر اور علم کی زیادتی سے ان کے حقائق میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی[۴]۔

---

[۱] قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ" (سورہ یونس۔۱۶) (کہو اگر اللہ چاہتا تو میں تمہیں وہ پڑھ کر نہ سناتا اور نہ تمہیں وہ اس سے واقف کرتا اس لئے کہ میں تم میں ایک اچھی خاصی عمر تک ٹھیرا رہا ہوں اور میں نے نہ کوئی دعویٰ کیا نہ کوئی کتاب پیش کی۔)

[۲] وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْۤا اَنْ يُّلْقٰۤى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ" (سورہ قصص ۸۶) (تم کو خود بھی یہ امید نہ تھی کہ تمہیں کتاب دی جائے گی، لیکن یہ سراسر اللہ کی مہربانی ہے۔)

[۳] وَلَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ" (سورہ انبیاء ۵۱) (ابراہیم کو پہلے ہی سے سلامت روی بخشی تھی، اور ہم ان سے پہلے سے واقف تھے) "اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" (سورہ انعام ۱۲۴) اللہ خوب واقف ہے کہ اس کی پیغامبری کا اہل کون ہے۔)

[۴] اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا" (سورہ النساء ۸۲) کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں ان کو بہت بڑا اختلاف نظر آتا)

(۸) ان کو اپنے حقائق کی صحت کا اس درجہ یقین ہوتا ہے، جس درجہ اہل علوم کو اپنے علوم کی صحت کا نہیں ہوتا، وہ تمام حقائق ان کے لئے گویا حسّی اور وجدانی ہوتے ہیں، جن میں کسی بحث اور مجادلہ سے ان کو کبھی شبہ نہیں پیدا ہوتا۔[۱]

(۹) ان کے ان مسائل غیب کے علاوہ جن کو وہ اصول موضوعہ کی طرح تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، اور جن کی عقل تنقید نہیں کر سکتی، باقی اور تفصیلات اور مسائل کی عقل پوری تائید کرتی ہے، اور ان میں اس کو بے شمار حکم اور مصالح نظر آتے ہیں، عبادات، اخلاق اور معاملات، تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ کا وہ ایک نہایت حکیمانہ نظام پیش کرتے ہیں،[۲] جس سے بہتر نظام دنیا کے حکماء پیش نہیں کر سکے، اور اس سے بہتر نظام دنیا کے تجربہ میں نہیں آیا۔

(۱۰) جن لوگوں نے ان کے اصول اولیہ تسلیم کر کے ان کی تعلیمات کو قبول کیا وہ علمی اور اخلاقی حیثیت سے اپنے معاصرین اور عام انسانوں میں بہت ممتاز اور بلند سیرت بن گئے، ان کا سا حسن سیرت ان کی سی پاکیزگی اخلاق، ان کی سی جامعیت، اور ان کا سا توازن و اعتدال، ان کی سی خدا ترسی، اور حق شناسی

---

[۱] ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۫عَلٰي بَصِيْرَةٍ﴾ (سورہ یوسف۔۱۰۸) (کہو یہ میرا راستہ ہے جس کی طرف میں علی وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں)۔ ﴿قُلْ اِنِّىْ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ﴾ (سورہ انعام، ۵۷) (کہو میں اپنے رب کی طرف سے ثبوت پر ہوں)۔

[۲] ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (سورہ جمعہ۔۲) (پیغمبر ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔)

دوسری اخلاقی و اصلاحی تعلیمات ۔ کے پیروؤں میں نظر نہیں آتی۔[1]

(۱۱) وہ مستقل علم غیب کے مدعی نہیں ہوتے، وہ ہر بات کا جواب اپنی طرف سے ہر وقت نہیں دے سکتے[2] بلکہ تنزیل اور "وحی" کے لئے ہمہ تن گوش اور سراپا چشم انتظار رہتے ہیں[3] اور ان کا اس پر کوئی اختیار نہیں ہوتا کہ جس وقت چاہیں، اور جس طرح چاہیں اس کو حاصل کرلیں، بعض اوقات یہ تنزیل اور "وحی" ان کی خواہش، بعض اوقات ان کے قیاس اور عمل کے خلاف ہوتی ہے، اس میں

---

[1] اس کی شاہد پیغمبروں کے ساتھیوں کی تاریخ اور ان کی سیرت ہے، آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں (صحابہ کرام) کی زندگی۔ دنیا میں محفوظ ہے ان تمام اوصاف میں جن کا اوپر ذکر کیا گیا، پیغمبروں کے بعد چشم فلک نے ان سے بہتر نمونہ نہیں دیکھا، قرآن اسی صفت کو لفظ تزکیہ (پاک کرنا اور مانجھنا) سے یاد کرتا ہے (وَيُزَكِّيهِمْ) پیغمبر اپنے ساتھیوں کو پاک کرتا ہے۔

[2] قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ" (انعام۔ ۵۰) (کہو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں میں تو اسی پر چلتا ہوں جو میرے پاس اللہ کا حکم آتا ہے، کہو کیا بینا اور نابینا برابر ہے، کیا تم غور نہیں کرتے۔)

[3] قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ" (سورہ البقرہ ۱۴۴) (آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف (وحی کے انتظار میں) اٹھنا دیکھتے ہیں۔)

ان پر عتاب بھی ہوتا ہے، نصیحت بھی ہوتی ہے[1]۔

(۱۲) ان کا اللہ سے بے حد خصوصی تعلق معلوم ہوتا ہے، خدا کی تائید و نصرت اور کائنات کی طاقتیں ان کی پشت پر معلوم ہوتی ہیں، ان کی مدد اور بعض اوقات ان کی صداقت کے اظہار کے لئے ایسے غیر معمولی واقعات پیش آتے ہیں، جو عالم کے عام قانون طبعی اور سلسلۂ اسباب کے خلاف ہوتے ہیں، اور انسانی ذہن و تجربہ خدا کی قدرت اور ان کی مقبولیت کے علاوہ ان کی ظاہری توجیہ و تعلیل سے قاصر ہوتا ہے، ان واقعات کے ظہور پر بھی ان کو کوئی اختیار نہیں ہوتا، اور لوگوں کی فرمائش کے باوجود بھی وہ اپنی مرضی سے ایسے واقعات ظاہر نہیں کر سکتے[2]۔

---

[1] اس کے متعدد شواہد قرآن مجید میں موجود ہیں ملاحظہ ہو آیت "مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ" (توبہ ۱۱۳) آیت "مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ" الآیۃ (سورہ انفال ۶۷) آیت "يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ" (سورہ تحریم ۔۱) سورہ "عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ" اور اس کی تفسیر۔

[2] "وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ" (سورہ عنکبوت ۔۵۰) (وہ کہتے ہیں کیوں نہ پیغمبر پر معجزات اتارے گئے کہو کہ معجزات کا تعلق اللہ ہی سے ہے، میں تو صرف ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں) "وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ" (سورہ رعد ۔۳۸) (کسی پیغمبر کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کوئی معجزہ ظاہر کرے سوائے اللہ کے حکم کے ہر وقت کا ایک نوشتہ ہے) "وَإِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ" (سورہ انعام ۳۵) (اگر تم پر ان کی بے رخی ایسی ہی شاق ہے تو اگر تم سے ہو سکے تو تم زمین میں سرنگ بنا کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر ان کے پاس کوئی نشانی (معجزہ) لے آؤ۔)

یہ انبیاء کرام کی جماعت اور ان کی خصوصیات ہیں، اور یہ ان کے دعوے کی شہادتیں اور قرائن ہیں، لیکن اس کی سب سے بڑی شہادت خود ان کی ذات اور سیرت ہوتی ہے، جو ایک طویل، مسلسل اور ممتد معجزہ بلکہ صدہا معجزات کا مجموعہ ہوتی ہے، اور اسی معجزہ پر انسانوں کی سب سے بڑی جماعت ایمان لاتی ہے۔

دوسری بڑی شہادت ان کی تعلیم اور ان کا وہ صحیفہ ہوتا ہے، جو ان کا ایک زندہ جاوید معجزہ ہوتا ہے، اور جو صدہا لفظی اور معنوی، اصلی اور ضمنی، داخلی اور خارجی معجزات پر مشتمل ہوتا ہے۔

اب غور کیجئے، یہ ماننے میں کہ خدا نے اپنے کسی بندہ کو اپنے دوسرے بندوں تک اپنا پیغام، اپنا کلام اور اپنے احکام پہنچانے کے لئے مقرر کیا اور ان کی رہنمائی اور رہبری کے لئے مامور کیا، کون سا عقلی اشکال ہے، اور اس میں کون سی چیز ایسی ہے جو خلاف عقل ہے۔

کیا یہ خدا کی قدرت اور اس کے صفات اور ان کے مقتضیات کے خلاف ہے؟

لیکن ایسا بداہتہً نہیں، خدا کو علیم و خبیر صاحب ارادہ و اختیار، صاحب قدرت و طاقت ماننے کے بعد اس میں کیا اشکال باقی رہ جاتا ہے، بلکہ دراصل اس کا مقابل پہلو، خدا کی صفات اور ان کے مقتضیات کے منافی ہے، خدا کی رحمت اور عدل کے یہ بالکل غیر مطابق ہے کہ وہ انسانوں کی اس بڑی آبادی کو قیاس و اشتباہ میں چھوڑ دے اور ان کی اس اہم رہنمائی اور رہبری کا انتظام نہ کرے۔

کیا یہ خدا کی عادت اور تاریخ کی شہادت کے خلاف ہے، یہ بھی صحیح نہیں، انبیاء کی ایک بڑی تعداد دنیا میں آئی، ہر اہم زمانہ اور ہر اہم قوم میں انبیاء پیدا ہوئے اور ان کے خلاف کوئی عقلی ثبوت فراہم نہ ہو سکا، ان کے دعوے کے ساتھ صدہا دلائل اور شواہد تھے،

مگر اس کے خلاف صرف زبانی دعویٰ تھا جس کے ساتھ کوئی دلیل اور ثبوت نہ تھا۔

کیا یہ حس اور تجربہ کے خلاف ہے؟ تو بے شک حواس اور عام انسانی تجربہ نفس نبوت کی شہادت فراہم نہیں کر سکتا لیکن اس کے پاس ایسی چیزیں ہیں، جن سے وہ اس کا کچھ قیاس کر سکتا ہے، اپنے معلومات پر غور کیجیے، پہلے (ابتدائے عمر میں یا حالتِ جہل میں) ہم کو وہ حاصل نہ تھے، اور ان میں سے بہت سے ہمارے اسلاف اور پیشروؤں کو بھی حاصل نہ تھے، لیکن تعلیم اور ایک نظام کے ماتحت وہ ہم کو حاصل ہوئے، اسی طرح انبیاء کو علم نبوت اس مخصوص طریقہ سے جو اس کے شایانِ شان ہے حاصل ہوتا ہے۔

یہی تینوں اشکالات ہیں، جن کا قرآن کی ایک ہی آیت میں جواب دیا گیا ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ	انھوں نے اللہ کو پوری طرح پہچانا نہیں
اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی بَشَرٍ	جب انھوں نے کہا کہ اللہ نے کسی انسان
مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ	پر کوئی چیز نہیں اتاری کہو کس نے وہ کتاب
الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّ	اتاری جو موسیٰ لے کر آئے تھے، روشن
هُدًی لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ	تھی، اور ہدایت تھی، لوگوں کے واسطے
تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ	جس کو تم ورق ورق کر کے لوگوں کو دکھاتے
مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ	ہو اور بہت سی باتوں کو چھپاتے ہو اور
قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ	تم کو علم دیا گیا، بہت سی ان باتوں کا
یَلْعَبُوْنَ ۝	جو تم نہیں جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ
(سورہ انعام ۔ ۹۱)	دادا، کہو کہ اللہ نے اتاری پھر چھوڑ دو ان کو
	اپنی فضول باتوں میں کھیلتے رہیں۔

اس آیت کے ابتدائی الفاظ میں کہا گیا ہے کہ جو رسالت و نبوت کا منکر ہے، وہ دراصل خدا کی صفات سے ناواقف اور اس کو اس کی کامل معرفت حاصل نہیں، جس کو اس کی صفت ربوبیت، صفت رحمت، اور صفت عدل کا کچھ بھی اندازہ ہوگا اور جو اس کی اس عنایت و توجہ سے واقف ہوگا، جو ابتدا سے انسان کے حال پر ہے، وہ رسالت کا انکار کبھی نہیں کر سکتا، جو ربوبیت کا ایک اہم ترین شعبہ، رحمت کا ایک کامل ترین مظہر اور عدلِ الٰہی کا ایک روشن ثبوت ہے۔

اس کے بعد کے حصہ میں نبوت کی ایک مشہور نظیر پیش کی گئی ہے "قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِىْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى"

اس کے بعد امکانِ نبوت پر ایک حسّی اور تجربی دلیل دی گئی ہے، اور وہ علم ہے، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ معلومات کی کوئی انتہا نہیں، اور ناواقفیت کے بعد واقفیت ہو سکتی ہے، بس حقیقتاً نبوت اور نبوت کے آثار و مظاہر میں کسی قسم کا کوئی عقلی اشکال نہیں، البتہ جو شخص اس بلند مقام پر نہیں ہے، وہ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا اور اس کے لئے نبی پر اعتماد اور اس کی تقلید کے سوا چارہ نہیں۔

اس مقام کے لحاظ سے اور اس کے آثار و خواص کے لحاظ سے پیغمبر اور غیر پیغمبر میں جو فرق ہوتا ہے، اس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل کے ذریعہ سے بیان کیا، جس سے بہتر نبوت کی تشریح اور اس سے زیادہ عام فہم تمثیل پیغمبروں کے کلام میں بھی ہماری نظر سے نہیں گزری۔

آپ ایک روز صفا کی پہاڑی پر تشریف لے گئے، اور عرب کا وہ نعرہ بلند کیا، جو دشمنوں کے اچانک حملہ آور ہو جانے پر امداد کے لئے بلند کیا جاتا تھا۔ اہل مکہ عرب کے

دستور کے مطابق کام چھوڑ چھوڑ کر کوہ صفا کے نیچے جمع ہو گئے، آپ نے پہلے ان سے فرمایا کہ تم نے آج تک مجھے کیسا پایا؟ انھوں نے کہا کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ راست باز اور دیانت دار پایا، اس طرح آپ نے اس اہم حقیقت کا اظہار فرمایا کہ نبوت کے دعویٰ سے پہلے سیرت کی پاکیزگی اور عام صداقت و دیانت ضروری ہے۔

اپنے متعلق ان سے اتنا بڑا اعتراف کروانے کے بعد آپ نے فرمایا کہ اگر میں تم کو یہ اطلاع دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر ہے، جو اچانک تم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے، کیا تم اس کو باور کرو گے؟

اہل عرب ناخواندہ تھے، مگر عقل عام سے محروم نہ تھے، اتنی موٹی بات ان کی سمجھ میں آسکتی تھی کہ ہم پہاڑ کے نیچے کھڑے ہوئے ہیں، پہاڑ کی پشت اور دوسری طرف کا حصہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، ایک شخص جو کبھی جھوٹ نہیں بولا پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہے، پہاڑ کی دونوں طرف اس کی نگاہ یکساں کام کر رہی ہے، وہ اگر پہاڑ کی دوسری جانب کی کوئی اطلاع دیتا ہے تو اس کے غلط ہونے کی کوئی عقلی وجہ نہیں۔

"انھوں نے کہا کہ "ہم اس کو یقیناً باور کریں گے، اس لئے کہ آپ سچے اور امین ہیں، اور اس وقت پہاڑ پر کھڑے ہوئے ہیں۔"

آپ نے فرمایا تو میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ خدا کا عذاب (جس کو تم نہیں دیکھتے) عنقریب تم پر آنے والا ہے۔"[1]

یہ درحقیقت نبوت کی ایک تمثیل تھی، جس کے لئے آپ نے یہ حکیمانہ پیرایہ اختیار کیا۔

پس جو لوگ اس بلندی پر نہیں ہوتے، وہ ان حقائق و علوم کا جن کا پیغمبر اللہ

[1] البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) ج ۳ ص ۳۸

کی تنزیل اور وحی سے اظہار کرتا ہے، محض اپنے نہ دیکھنے ـــــ یا علم نہ رکھنے کی بنا پر یہ محض قیاس وتخمین کی بنیاد پر انکار نہیں کرسکتے، وہ صرف اپنے مشاہدے اور اپنے علم کی نفی کرسکتے ہیں، لیکن (بقول امام ابن تیمیہؒ) عدم علم اور علم عدم (یعنی نہ جاننا اور یقین کے ساتھ یہ جاننا کہ نہیں ہے) ان دونوں میں بڑا فرق ہے، اور جہاں تک علم کا تعلق ہے، پیغمبر کی اطلاع علم کا بہترین ذریعہ ہے۔

جب ایسے لوگ جن کو نبوت اور ماوراء حس وعقل حقائق واسرار کا کوئی ادراک نہیں، پیغمبر سے اس کی غیبی بصیرت اور اس کے مشاہدات کے بارہ میں بحث اور حجت کرتے ہیں تو وہ تنگ ہو کر ان سے کہتا ہے:۔

اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ	کیا تم مجھ سے اللہ کے بارہ میں بحث و حجت کرتے ہو حالانکہ اس نے مجھے راستہ دکھایا اور حق سمجھایا۔
(سورہ انعام۔۸۰)	

جو کچھ پیغمبر نے دیکھا اور جو کچھ وہ دیکھتا ہے، اس کو نہ دکھا سکنے اور وہ یقین جو اس کو حاصل ہوتا ہے، نہ پیدا کرسکنے کی مجبوری کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے:۔

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ۔	اس نے کہا کہ اے قوم دیکھو اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشنی اور یقین پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت بخشی پھر وہ تمہاری نظر سے مخفی رہی، کیا ہم تم کو اس پر مجبور کرسکتے ہیں، حالانکہ تم اس کو پسند نہیں کرتے۔
(سورہ ہود۔۲۸)	

ایسے عام لوگوں کے اچھے خاصے حواس (جو اپنے محسوسات کا پورا ادراک کرتے ہیں) اور ان کی عقل (جو اپنے دائرہ میں پورا کام کرتی ہے) علوم نبوت کے ادراک میں بالکل ناکارہ اور کند ثابت ہوتی ہے۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ	بلکہ ان کا علم تھک کر گر گیا آخرت کے
بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا	بارہ میں بلکہ وہ اس کی طرف سے شک
عَمُوْنَ ۝ (سورہ نمل۔۶۶)	میں ہیں بلکہ وہ اس سے نابینا ہیں۔
يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	دنیاوی زندگی کے ظاہری مسائل کا وہ
وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝	علم رکھتے ہیں، اور آخرت سے وہ
(سورہ روم۔۷)	بے خبر ہیں۔

اگر وہ ان مسائل میں کوئی گفتگو کریں بھی تو اس کی بنیاد کسی یقین اور مشاہدہ پر نہیں ہوتی، وہ محض ان کی قیاس آرائی ہوتی ہے۔

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ	ان کو اس کا کوئی علم نہیں وہ محض گمان
اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ	کی پیروی کرتے ہیں اور گمان حقیقت کا
الْحَقِّ شَيْئًا ۝ (سورہ النجم۔۲۸)	قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

انبیاء کرام کی تعلیمات

اب ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبروں نے اللہ کی ذات و صفات، اس کی مخلوقات اور اس کائنات، اللہ کے اس سے تعلق اور اس کے اللہ سے تعلق، اس کی حقیقت، اس کے انجام، انسان کی زندگی کی غرض و غایت اور اس کے کمال مطلوب سے متعلق

کیا معلومات بخشی ہیں، اور تمدن و اجتماع اور اخلاق کی کون سی اساس عطا کی ہے، پھر ہم دیکھیں گے کہ اس اساس پر انسانی زندگی کی جو عمارت تعمیر ہوتی ہے اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں؟

یاد رہے کہ فلاسفہ اور اشراقیوں کے برخلاف اس بارہ میں پیغمبروں کی تعلیمات بالکل متحد ہیں، ان کے بیانات میں کوئی اختلاف نہیں، اس موقع پر مناسب تھا کہ مختلف پیغمبروں کے صحیفوں کے بیانات اور اقتباسات پیش کیے جاتے، لیکن ان میں سے اکثر صحیفوں کے ضائع ہو جانے اور باقی کے محفوظ نہ رہنے کی وجہ سے (جیسا کہ ان کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے) تحقیق و جستجو کے بعد بھی ان مسائل پر زیادہ مواد پیش نہیں کیا جا سکتا، اس لئے ہم صرف آخری صحیفۂ آسمانی قرآن مجید کے اقتباسات پیش کرتے ہیں، جو ان سب کتابوں کا محافظ و نگراں ہے، اور ان سب کی نمائندگی کے لئے کافی ہے۔

خالقِ کائنات اور کائنات

خدا کی صفات اور اس کے کام

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ	وہ اللہ ہے جس کے سوا کسی کی بندگی نہیں
الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ	وہ بادشاہ ہے، پاک ذات سب عیبوں سے
الرَّحِیْمُ ○ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ	سالم، امان دینے والا، پناہ میں لینے
اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ	والا، زبردست دباؤ والا، صاحب
الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ	عظمت، پاک ہے اللہ لوگوں کے شریک
الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ	بتلانے سے وہ اللہ ہے، بنانے والا، نکال

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ	ٹھیک ٹھاک کرنے والا، صورت کھینچنے والا
لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ	اس کے ہیں سب نام عمدہ، پاکی بول رہا
مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ	ہے اس کی جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (سورہ الحشر ۲۴-۲۲)	اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا۔

دنیا کی پیدائش اور اس کا انتظام

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	بے شک تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے
وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى	آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا
عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ	پھر وہ عرش پر متمکن ہوا، اڑھاتا ہے
حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ	رات پر دن کو کہ وہ اس کے پیچھے لگا آتا
مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ	ہے دوڑتا ہوا، اور پیدا کئے سورج چاند اور
وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ	تارے اس کے حکم کے تابعدار سن لو اسی کا
الْعٰلَمِيْنَ	کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا بڑی برکت
(سورہ اعراف ۵۴)	والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہانوں کا۔

خدا کی بادشاہی اور اس کی طاقت و فرمانروائی

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ	پوچھو کون تم کو روزی دیتا ہے آسمان
وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ	سے اور زمین سے یا کون مالک ہے کان
وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَىَّ	اور آنکھوں کا اور کون نکالتا ہے زندہ

مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ	کو مردہ سے اور کون نکالتا ہے مردہ کو
الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ	زندہ سے اور کون تدبیر کرتا ہے کاموں
اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝	کی وہ یہی کہیں گے کہ اللہ، کہو پھر کیوں
(سورہ یونس ۳۱)	نہیں ڈرتے۔
قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَا اِنْ كُنْتُمْ	کہو کس کی ہے زمین اور جو کوئی اس میں ہے
تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ	اگر تم جانتے ہو وہ یہی کہیں گے کہ اللہ کی،
اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ	کہو پھر کیوں نہیں سوچتے، کہو کون مالک ہے
السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ	ساتوں آسمان کا اور مالک ہے اس بڑے
الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا	عرش کا وہ اللہ ہی کو بتائیں گے، کہو پھر
تَتَّقُوْنَ ۝ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ	کیوں نہیں ڈرتے، کہو کس کے ہاتھ میں ہے
كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ	حکومت ہر چیز کی اور وہ بچا لیتا ہے
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ	اور اس کو کوئی نہیں بچا سکتا، وہ اللہ ہی
لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝	کو بتائیں گے کہو پھر یہ کیسا تم پر
(سورہ مومنون ۸۹-۸۴)	جادو ہے۔
وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	کہو اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور
وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا اَفَغَيْرَ اللّٰهِ	زمین میں ہے اس کی فرمانروائی ہے ہمیشہ
تَتَّقُوْنَ ۝ (سورہ النحل ۵۲)	کیا اللہ کے سوا کسی اور سے ڈرتے ہو۔
اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗ	کیا اللہ کی تابعداری کے سوا کچھ اور
اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	ڈھونڈتے ہیں حالانکہ اس کے سامنے

طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ٥ (سورہ آل عمران ۳ - ۸۳)

سرافگندہ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی یا لاچاری سے اور اس کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔

یہ کارخانۂ عالم عبث پیدا نہیں کیا گیا اور اس کی آفرینش بے مقصد و بے فائدہ نہیں

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ط (سورہ ص - ۲۷)

ہم نے آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کو بیکار و ناحق پیدا نہیں کیا۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ٥ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج (سورہ آل عمران ۱۹۱ - ۱۹۰)

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور دن اور رات کے الٹ پھیر میں بڑی نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے جو اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اور غور کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور ان کو دیکھ کر پکار اٹھتے ہیں) کہ اے ہمارے پروردگار تو نے اس کو بیکار نہیں پیدا کیا۔

انسان کی زندگی بھی بے مقصد نہیں اور وہ اس دنیا میں آزاد نہیں

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ

کیا انسان سمجھتا ہے کہ وہ آزاد و بیکار

سُدًی ۝ (سورہ قیامہ ۳۶)	چھوڑ دیا جائے گا۔
اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ	کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بیکار
اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝	پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم لوٹ کر ہمارے
(سورہ مومنون ۱۱۵)	پاس نہ آؤ گے۔

موت و زندگی کا مقصد انسان کی آزمائش ہے

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ	وہ اللہ جس نے موت اور زندگی کو اس لئے
لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ	بنایا کہ تم کو آزمائے کہ تم میں عمل کے اعتبار
(سورہ الملک ۲)	سے سب سے اچھا کون ہے۔
ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ	پھر ہم نے تم کو (گذشتہ نسلوں کا) جانشین
لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۔	بنایا ان کے بعد تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا
(سورہ یونس ۱۴)	عمل کرتے ہو۔

دنیا کی آرائش انسان کے امتحان کے لئے ہے

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا	بے شک ہم نے زمین کی چیزوں کو اس کی
لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝	زینت بنایا تاکہ ہم اہل زمین کو آزمائیں کہ
(سورہ کہف ۷)	ان میں کس کا عمل سب سے اچھا ہوتا ہے۔

انسان اشرف المخلوقات ہے

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ	ہم نے آدم کی اولاد کو بڑی عزت دی اور

فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ	ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سوار کرایا
الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ	اور ہم نے ان کو پاک اور لذیذ چیزیں عطا
خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ۝	کیں اور ان کو اپنی بہت سی مخلوق پر اچھی
(سورہ بنی اسرائیل ۷۰)	خاصی فضیلت دی۔
لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ	ہم نے انسان کو بہترین انداز سے پر
تَقْوِیْمٍ ۝ (سورہ والتین ۴)	پیدا کیا۔

انسان زمین پر خدا کا نائب ہے

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ	جب کہ تمہارے پروردگار نے کہا کہ میں زمین
فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۝ (سورہ بقرہ ۳۰)	میں اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں۔

انسان اللہ کے خزانوں کا اللہ کی طرف سے امین ہے

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ	اور خرچ کرو اس میں سے جو اس نے
فِیْهِ ۝ (سورہ حدید ۷)	تمہارے ہاتھ میں دیا ہے اپنا نائب کر کے

زمین پر جو کچھ ہے وہ انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ	وہ ہے جس نے تمہارے لئے
جَمِیْعًا ۝	پیدا کیا ہے جو کچھ زمین میں

(سورہ بقرہ ۲۹)

اور انسان خود خدا کی بندگی کے لئے ہے

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا	میں نے جن و انسان کو صرف اس لئے
لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ	پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں میں ان سے
رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝	کسی رزق کا طلب گار نہیں نہ اس کا
(سورہ الذاریات ۵۷۔۵۵)	امیدوار ہوں کہ مجھے کھلائیں۔

اللہ کی پیدا کی ہوئی نعمتیں انسان کے استعمال ہی کے لئے ہیں

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ	کہو کس نے حرام کی اللہ کی وہ زینت جو اس نے
اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ	بندوں کے لئے پیدا کی اور کھانے پینے کی
الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي	پاک صاف چیزیں، کہو یہ سب نعمتیں اہل ایمان
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ	کے لئے ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت
(سورہ اعراف ۳۲)	میں خاص انہی کے لئے ہیں۔

کھانا پینا گناہ نہیں، اسراف گناہ ہے

وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ	اور کھاؤ پیو اور حد سے نہ بڑھو،
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝	بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں کو
(سورہ اعراف ۳۱)	دوست نہیں رکھتا۔

تمام انسان ایک انسان کی نسل ہیں ایک دوسرے پر فضیلت صرف تقویٰ سے ہو سکتی ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ (سورہ حجرات ۱۳)

اے لوگو ہم نے تم کو ایک ہی مرد و عورت (آدم و حوا) سے پیدا کیا، اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور قبیلے تاکہ آپس کی پہچان ہو اللہ کے یہاں عزت اسی کی ہے جس کو اس کا بڑا ادب ہے۔

دوسری زندگی

اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں اس دنیا کے اعمال کی جزا ملے گی اور ذرہ ذرہ کا حساب ہو گا

إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (سورہ الغاشیہ ۲۶-۲۵)

ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے پھر ہمارے ذمہ ان کا حساب کتاب ہے۔

إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ (سورہ یونس ۴)

اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے یہ اللہ کا ٹھیک ٹھیک وعدہ ہے، وہ پیدائش شروع کرتا ہے پھر اس کو دہرائیگا تاکہ ایمان اور عمل صالح والوں کو انصاف کے ساتھ ان کا صلہ دے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِن كَانَ

اور ہم انصاف کی ترازوئیں رکھیں گے قیامت کے دن پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کچھ ہوگا تو ہم

مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ	اس کو قیامت کے دن لے آئیں گے اور ہم
وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝ (سورہ انبیاء ۴۷)	حساب کرنے کے لئے کافی ہیں۔
فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝	جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اس کو
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝	دیکھے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا
(سورہ زلزال ۸-۷)	وہ اس کو دیکھے گا۔

اس دنیا کی زندگی بے حقیقت اور فانی ہے اور آخرت کی زندگی حیات جاودانی ہے

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ	یہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشہ ہے
وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ؕ	اور آخرت کی زندگی ہی زندگی جاودانی
لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورہ عنکبوت ۶۴)	ہے اگر وہ جانیں۔

آخرت میں انجام نیک لوگوں کا ہے جو اس دنیا میں اپنی برائی اور بگاڑ نہیں چاہتے

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ	یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے
لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ	جو (اس دنیا کی زندگی میں) زمین پر اپنی
وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝	بڑائی اور بگاڑ نہیں چاہتے اور انجام
(سورہ القصص ۸۳)	نیک خدا سے ڈرنے والوں کا ہے۔

یہ خالق کائنات، کائنات، زندگی، انسان، ان کے انجام، ان کی نشأت ثانیہ کے متعلق وہ علوم اور حقائق و مسلمات ہیں جو پیغمبر کے ذریعہ انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں، اس علمی، ذہنی اور اخلاقی اساس پر زندگی کی جو عمارت تعمیر ہوتی ہے، اس کے نقشہ اور تفصیلات کے بارہ میں قیاس کرنا کچھ مشکل نہیں، جس طرح ایک بیج کو دیکھ کر ایک پہچاننے والا انسان آسانی سے پیشگوئی کر سکتا ہے کہ اس سے کون سا درخت تیار ہوگا، اس کی کیسی پتیاں ہوں گی، اور اس میں کون سا پھل ظاہر ہوگا، اور ایک عالم نباتات یا طبیب اس کے خواص و اثرات اور اس کے اجزا کے متعلق تفصیلی اطلاع دے سکتا ہے، اسی طرح وہ لوگ جو اس حقیقت پر نظر رکھتے ہیں کہ اس عالم، اس کا نظام، اس کے آغاز و انجام، مقصد زندگی، منصب انسانی اور ایسے ہی دوسرے بنیادی اور کلی مسائل کے متعلق کوئی خاص عقیدہ اور نظریہ زندگی کی دوسری تفصیلات پر کس قدر اثر انداز ہوتا ہے، وہ آسانی کے ساتھ اس تمدن کے خط و خال تجویز کر سکتے ہیں، جو اس بنیاد پر قائم ہوگا

حسی، عقلی، اشراقی اور اس الہامی تعلیمات اور تمدن کی بنیاد و اصول میں جو تضاد ہے، اس کی طرف آپ کو متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ تضاد جس طرح اجمال میں ہے اسی طرح

تفصیل میں بھی ہے جس طرح آم کی گٹھلی اور املی کے بیج میں اختلاف ہے اسی طرح اس کی پتیوں اور ان کے پھل میں اختلاف ہوگا، اور یہ اختلاف ان درختوں کے بڑھنے اور پھیلنے اور پرانے ہونے سے دور نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ ایسے "متناقص الاصل" نظامِ حیات میں کوئی جوہری مشابہت دیکھیں تو سمجھ لیجئے کہ یا تو آپ نے جو اس کی اصل اور بنیاد قرار دی ہے اس میں آپ سے غلطی ہوئی یا اس تمدن میں کسی دوسرے شجرِ حیات کا قلم باندھا گیا ہے اور ایسا ممکن ہے کہ ایسا مرکب درخت دو قسم کے پھل دے، خود الہامی تمدن کے ساتھ بارہا ایسا پیش آیا ہے کہ اس میں حسّی یا اشراقی تمدن کا پیوند لگا یا گیا ہے، اسلام کی تاریخ میں متعدد بار یہ واقعہ پیش آیا، خلافت راشدہ کے بعد اس درخت میں کبھی جاہلیتِ عرب کا، کبھی ملوکیتِ عجم کا اور کبھی یونانی اور ایرانی اشراقیت کا اور کبھی مادہ پرستانہ حسّی طرزِ زندگی کا قلم باندھا گیا، اسی مرکب درخت کو عام طور پر اسلامی تمدن اور اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے، اور اسی کے پھلوں پر ہمارے بعض مسلمان مصنف و مورخ فخر کرتے ہیں۔

اسلامی تمدن کا لفظ عام طور پر جب بولا جاتا ہے تو ذہن فوراً دمشق و بغداد، قرطبہ و غرناطہ اصفہان و سمرقند اور دہلی و لکھنؤ کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور آنکھوں کے سامنے ایک خاص طرزِ تعمیر پھر جاتا ہے (جس کو اسلامی فنِ تعمیر کہا جاتا ہے) جس کے نمونے بادشاہوں کے شاندار محل، خوبصورت حرم سرائیں، وسیع ڈیوڑھیاں اور نوادرِ روزگار مقبرے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کی خوش ذوقی اور زندہ دلی کے مختلف مظاہر فنونِ لطیفہ کی سرپرستی اور شہروں اور دار السلطنتوں کی آزاد و پر عشرت شہری زندگی کے مناظر تازہ ہو جاتے ہیں، حالانکہ ان میں سے بہت سی چیزیں مسلمان بادشاہوں اور امرا کے بیکار اسراف اور اصول و احکام اسلام سے انحراف اور بعض اوقات تحریف کی یادگاریں ہیں (جو اگر وہ شریعت کے احکام کی پابندی کرتے) تو وجود ہی میں نہ آتیں اور جب کبھی اسلامی تمدن اپنی پوری روح اور جسم کے ساتھ موجود ہوگا تو یہ چیزیں نا پید ہوں گی، اسلام میں غیر ضروری تعمیرات جن کا مقصد شان و شوکت کے اظہار

عیش و عشرت یا شہرت اور یادگار کے سوا کچھ نہ ہو ناپسندیدہ ہیں مقبرہ بنوانا تو خالص غیر اسلامی عمل و اسراف کے علاوہ شرعی نقطۂ نگاہ سے بھی ایک ناجائز کام ہے، اسلام اس کو بالکل ناجائز اور خلاف انصاف سمجھتا ہے کہ آدمی مرنے کے بعد بھی زمین کے ایک بڑے حصہ پر بے ضرورت قابض رہے اور اس کے مقبرہ کی اینٹوں اور دیواروں اور آرائش پر وہ روپیہ ضائع ہو جو سیکڑوں آدمیوں کے سر چھپانے کے کام آسکتا تھا، خالص اسلامی نقطۂ نظر سے، نیک عمل، صالح اولاد یا صدقۂ جاریہ کے علاوہ کسی اور طریقہ پر دنیا میں اپنا نام زندہ رکھنے کی کوشش جاہلیت کی ایک یادگار ہے۔

اسی طرح موسیقی کی ہمت افزائی اور سرپرستی کے بجائے اگر کہا جائے کہ اسلام نے اس کی ہمت شکنی اور ناقدری کی ہے تو صحیح ہوگا، مصوری اور بت تراشی اس کی شریعت میں حرام ہیں ریشم کا استعمال مردوں کے لئے ناجائز ہے، سونے، چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع ہے اور وہ تمام چیزیں جو زندگی میں غفلت، دنیا میں انہماک اور عیش و تنعم پیدا کریں اس کے تمدن میں ان کی روک تھام کی گئی ہے اور ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا، حدیث میں آتا ہے "ان عباد اللہ لیسوا بالمتنعمین" (اللہ کے بندے عیش و عشرت کے بندے نہیں ہیں)

حقیقت میں جس کو اسلامی تمدن اور اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے، اور جس پر ایک عرصہ سے ہمارے قومی مصنف اور مورخ فخر کرنے کے عادی ہیں اور جس کو وہ موجودہ مغربی تمدن کے مقابلہ میں پیش کر کے ایک فاتحانہ مسرت محسوس کرتے ہیں، وہ مسلمان بادشاہوں اور مسلمان کہلانے والی قوموں کا طرز زندگی ہے اور اس کو اسلام سے صرف اتنا تعلق ہے کہ اس کے نمائندے اپنے کو مسلمان کہتے تھے، اور بہت سے اسلامی فرائض و احکام کے بھی پابند تھے۔

لیکن اگر یہ عمل تلقیح (پیوند بندی) پیش نہ آئے اور دو مختلف النوع درختوں کو علیحدہ علیحدہ نشو نما حاصل کرنے کا موقع دیا جائے تو ان میں اتحاد کا کوئی امکان نہیں، اور ان میں اس کے سوا کوئی مابہ الاشتراک شے نہ ہوگی کہ وہ دونوں درخت ہیں، اور اسی زمین پر قائم ہیں بعینہٖ اسی طرح ان دونوں تمدنوں میں ان ظاہری اشتراکات کے سوا اور ان کے نمائندوں میں

(اگر وہ اس کی روح کے حامل ہوں) انسان کی منطقی تعریف کے سوا (کہ وہ حیوان ناطق) ہے، اور کوئی قدر مشترک نہیں۔

مزید براں دونوں کا نظام صحت، دونوں کے اسباب ترقی اور دونوں کے معاون ایک دوسرے سے مختلف اور بعض اوقات متصادم ہوں گے، الہامی تمدن کے لئے جو حالات ترقی اور فروغ کا باعث ہیں، حسی اور مادی تمدن کے لئے وہ زوال وانحطاط کا سبب ہوں گے، حسی تمدن کے لئے جو باتیں باعثِ فخر ہوں گی، الہامی تمدن کو اس میں ننگ و عار محسوس ہوگا، ایک کا موسم بہار دوسرے کے حق میں فصل خزاں ہے، ایک کے حق میں جو چیز آبِ حیات کا کام دے گی، وہ دوسرے کے حق میں سم قاتل ہوگی۔

اب ذرا اس الہامی تمدن کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ ان کا انسان کی عقلیت و نفسیت اور اس کے اخلاق اور اجتماع پر کیا انقلاب انگیز اثر پڑتا ہے۔

سب سے پہلے وہ اس عالم کے متعلق یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ نہ کوئی بے بادشاہ کی سلطنت ہے، نہ چند بادشاہوں کی مشترک سلطنت ہے، بلکہ اس کا ایک ہی مالک ہے، جو اس کا خالق و صانع بھی ہے اور اس کا منتظم و حاکم بھی، خلقت بھی اس کی ہے، ملک بھی اس کا ہے، اور حکم بھی اسی کا ہے (اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ) اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے، اسی کی قدرت سے ہوتا ہے، حقیقی علت اس کا ارادہ اور اس کی قدرت ہے، یہ ساری کائنات تکوینی طور پر (جس کا تعلق عالم کے نظم و نسق سے ہے) اس کے سامنے سرافگندہ اور اس کے احکام کی مطیع ہے (وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) پس وہ مخلوقات جو صاحب ارادہ واختیار ہیں، ان کو بھی اس کے سامنے سر جھکا دینا چاہیئے (اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ)۔

اس کا سب سے پہلے ذہنی اثر یہ پڑتا ہے کہ سارے عالم میں ایک مرکزیت و تنظیم

(بظاہر) منتشر اجزاء عالم میں ایک ربط اور قانون میں ایک وحدت نظر آنے لگتی ہے' اور انسان زندگی کی مکمل توجیہ کر سکتا ہے' اور اس کا فکر اور رویہ اس کائنات کے بارہ میں حکمت و بصیرت پر مبنی ہوتا ہے۔[1]

اخلاق و عمل پر اس کا اثر اس سے زیادہ اہم اور انقلاب انگیز ہے' اس کے دل و دماغ سے اپنی خود مختاری اور اللہ کی اس سلطنت میں حکومت خود اختیاری کا جذبہ اور خیال (جو شرور و فسادات' نزاع و تصادم کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے) نکل جاتا ہے' وہ اس زمین کے باشندوں کو' دولت کے خزانوں کو اور خود اپنی طاقتوں اور اپنے جسم و

---

[1] فلسفہ بھی مذہب کے اس مخصوص اثر کو تسلیم کرتا ہے' اور اس کو اس بارہ میں اپنی عاجزی کا اعتراف ہے۔

فلسفۂ جدید کا جرمن مورخ (ڈاکٹر ہرلڈ ہوفڈنگ) لکھتا ہے۔

"کسی توحیدی مذہب کی اساس فکر یہ ہوتی ہے کہ تمام اشیاء کی ایک واحد علت ہے' ان مشکلات سے قطع نظر کرتے ہوئے جو اس خیال سے لازماً پیدا ہوتی ہیں' اس کا ایک اہم اور مفید اثر انسانی طبائع پر ہوتا ہے کہ ان کو اختلافات اور تفصیلات سے نظر انداز کر کے ایک قانون کے مطابق تمام اشیائے عالم کو مربوط اور منضبط سمجھنے کی عادت ہو جاتی ہے' علت کے ایک ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ قانون بھی ایک ہو' ازمنہ متوسطہ نے یہ خیال لوگوں کے ذہن نشین کرایا' جس سے غیر مہذب انسان مذاہب کی کثرت سے مغلوب اور رسائل پہ تکثیر ہو کر بہت دور رہتا ہے' ساتھ ہی توحید کا خیال انسان کو سائنس کے نظریہ کائنات کے لئے تیار کرتا ہے' کیونکہ تمام سائنس میں یہی کوشش کی جاتی ہے' کہ مظاہر کی توجیہ کم سے کم اصولوں سے کی جائے گو اس کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑے کہ کسی ایک اعلیٰ ترین قانون کا تصور ایک ناقابل حصول نصب العین ہے"! (تاریخ فلسفہ جدید ص۵)

اعضا کو اپنی ملک نہیں سمجھتا ہے، بلکہ خدا کی امانت سمجھتا ہے، اور اس کی اجازت اور اس کے قانون کے خلاف ان کے استعمال اور ان میں تصرف کرنے سے ڈرتا ہے، وہ اپنے سے ایک بلند و بالا طاقت کے مقابلے میں اپنے کو محکوم اور ایک بڑی عدالت کے سامنے اپنے کو جواب دہ سمجھتا ہے، ان اعتقادات و تسلیمات کا اخلاق و عمل کی جزئیات اور زندگی کی تفصیلات پر جو اثر پڑتا ہے، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس عالم اور زندگی کے بامقصد ہونے کا خیال اور انسان کے آزاد نہ ہونے کا اعتقاد، اس میں اپنی ذمہ داری کا احساس، اور زندگی کی حقیقی قیمت کا شعور پیدا کرتا ہے، اس کو زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اپنی عمر کی ایک ایک سانس غنیمت معلوم ہوتی ہے، اور وہ ان کو ضائع نہیں کرنا چاہتا، مگر ان کی قدر اس کو اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ عیش و تفریح کے لئے زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ کرے بلکہ اس لئے کہ وہ زندگی جاوید کے لئے جو اس کو مرنے کے بعد حاصل ہوگی، اپنی راحت کا سامان کرے۔

وہ زندگی اور اس دنیا کی آرائش و زیبائش کو امتحان و آزمائش سمجھتا ہے، اس لئے وہ اس دنیا کو ایک وسیع تفریح گاہ اور اس زندگی کو ایک طویل فرصتِ عیش سمجھنے کے بجائے اس دنیا کو ایک امتحان گاہ سمجھ کر قدم رکھتا ہے، اس کا ہر قدم سوچ سمجھ کر پڑتا ہے، وہ ہر کام دیکھ بھال کر کرتا ہے، اس پر کسی وقت مدہوشی اور خود فراموشی طاری نہیں ہوتی۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے کسی نے فرمائش کی کہ حضرت عمرؓ کی تعریف کریں، انھوں نے کہا کہ "وہ ایسے خائف اور ہوشیار پرندہ کی طرح رہتے تھے، جس کو یقین ہے کہ

ہر راستہ پر اس کے لئے جال بچھے ہوئے ہیں!!

اس زندگی کو بے حقیقت اور فانی اور موت کے بعد کی زندگی کو ابدی اور جاودانی سمجھنے کا عقیدہ اس دنیا کو اس کی تمام دلچسپیوں اور توجہات کا مرکز بننے سے مانع ہوتا ہے، اس لئے اس زندگی کی کامیابی کے معیار، اشیاء و افعال کے متعلق اس زندگی کا مادی نقطۂ نظر، اخلاق کی یہ دنیاوی قدر و قیمت، ان کی نظر میں اصل اور دائمی نہیں ہوتی، اس کے لئے اشیاء و اخلاق کے وزن کرنے اور ان کی تقویم کے لئے دوسری میزان اور دوسرا مقوم ہوتا ہے، اور وہ ان کا دینی نفع اور اخروی اجر ہے[1]۔

ان کو اس دنیا کے عیش و لذت میں کبھی انہماک نہیں ہوتا، ان میں اس زندگی کو زیادہ سے زیادہ پر راحت اور آسان بنانے کے لئے کبھی جذبۂ مسابقت پیدا نہیں ہوتا (جو تمام اقتصادی، اخلاقی اور اجتماعی خرابیوں کا اصل سبب ہے) وہ بادشاہی میں بھی ایسی زاہدانہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے ہیں، جس کی مثال تارک الدنیا راہب اور صحرا نشین زاہد بھی نہیں پیش کر سکتے۔

حضرت عمر رضؓ کے زہد کے واقعات آپ نے سنے ہوں گے، کچھ پر تکلف کھانے

---

[1] اس عقیدہ کا جو اثر انسان کے اعمال و اخلاق پر پڑتا ہے، اس کی وسعت اور گہرائی کا اعتراف مادی علماء اخلاق کو بھی ہے، لیکی تاریخ اخلاق یورپ میں لکھتا ہے۔

"اگر انسان واقعی یہ سمجھ لے کہ اسے اپنے اعمال کا معاوضہ ایک دائمی عذاب یا دائمی ثواب کی صورت میں کسی ہمہ داں اور ہمہ بیں حاکم کی عدالت میں ملے گا، تو یہ خیال نیک کرداری کا ایسا زبردست محرک ہوگا، جس کے سامنے ارتکاب معصیت کی کوئی تاویل چل نہیں سکتی" (لیکی تاریخ اخلاق یورپ نیویارک (۱۹۵۵) ص۱۳)

کے لئے اگر کوئی سفارش کرتا تو فرماتے کہ "مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں قیامت میں مجھ سے یہ نہ کہا جائے کہ "اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا" (تم اپنے سارے مزے دنیا میں اڑا چکے اور ان کا لطف اٹھا چکے) کوئی اگر لذیذ کھانا پیش کرتا تو پوچھتے کہ "کیا سارے مسلمان یہ کھاتے ہیں، یا کھا سکتے ہیں؟" نفی میں جواب ملنے پر اس کو ہاتھ نہ لگاتے۔

بیت المقدس کا شاہانہ اور فاتحانہ سفر جس شان سے فرمایا وہ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، سواری میں ایک اونٹ سر کھلا ہوا، پاؤں کے لئے رکاب بھی نہیں جو اونٹ کا نمگیرہ وہی سونے کا بستر، سامان کی جو خرجی وہی سر کا تکیہ، بدن پر گزی کا کرتہ جو پہلو سے پھٹا ہوا، اس شان سے وہ سفر کر رہا ہے، جو روئے زمین کا سب سے طاقتور بادشاہ ہے۔

حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے ایک رفیق ضرار بن ضمرہ سے کہا کہ علیؓ کا حال بیان کرو، انھوں نے معذرت کی، لیکن جب حضرت معاویہؓ نے اصرار کیا تو انھوں نے جو تعریف کی اس کے بعض فقرے آپ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ خلافت و حکومت میں بھی ان لوگوں کی کیا حالت تھی۔

> "ان کو دنیا اور اس کی بہار اور رونق سے وحشت ہوتی تھی، اور رات اور اس کی تاریکی میں دل بہلتا تھا، آنکھیں پر اشک رہا کرتی تھیں، ایک لمبے فکر اور سوچ میں رہا کرتے، لباس وہ پسند آتا جو موٹا ہو، کھانا وہ دل کو بھاتا جو معمولی اور

سادہ ہو، بالکل معمولی آدمی کی طرح رہتے، ہم میں ان میں کوئی فرق معلوم نہ ہوتا، جب ہم کچھ پوچھتے تو جواب دیتے، جب ہم آتے تو وہ سلام میں پہل کرتے، جب ہم بلاتے تو بے تکلف آجاتے، لیکن ان کے یہاں اس تقرب اور ہمارے اس قرب کے باوجود رعب اتنا تھا کہ ہم گفتگو نہ کرسکتے، اور خود چھیڑ کر بات نہ کرسکتے، دینداروں کی تعظیم کرتے تھے، اور مسکینوں سے محبت رکھتے تھے، طاقتور کو ان سے کسی غلط چیز کی امید نہ ہوتی، اور کمزور ان کے انصاف سے ناامید نہ ہوتا، بخدا! میں نے ان کو بعض مواقع پر اس وقت دیکھا ہے کہ رات نے اپنے پردے ڈال دیئے تھے، اور تارے ڈھل گئے تھے، وہ اپنی محراب میں کھڑے تھے، داڑھی پکڑے ہوئے، مارگزیدہ کی طرح تڑپتے تھے، اور اس طرح روتے تھے کہ جیسے دل پر چوٹ لگی ہو، گویا کہ میں سن رہا ہوں اور وہ کہہ رہے ہیں، اے دنیا! اے دنیا! کیا مجھ سے چھیڑ کرنے چلی ہے، اور مجھ پر تیری نظر ہے، اس کی امید نہ کرنا کسی اور کو فریب دے، میں نے تجھ کو ایسا چھوڑا ہے کہ کبھی تیرا نام بھی نہ لوں گا، تیری عمر مختصر، تیری زندگی بے وقعت اور تیرا خطرہ بہت ہے، ہائے سامانِ سفر کس قدر کم ہے، سفر کتنے دور کا ہے راستہ کتنا وحشتناک ہے۔[1]

---

[1] صفۃ الصفوۃ ابن جوزی ج ۱ ص ۱۲۲

آخرت کے یقین، محاسبہ کے ڈر اور خدا کے خوف نے ذمہ داری کا ایسا احساس اور اتنی احتیاط پیدا کر دی تھی، جس کا تصور بھی مشکل ہے، شائد ان چند واقعات سے اس کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ میری خلافت و حکومت کی حقیقت کیا ہے، بس اتنی کہ تین آدمی سفر میں ہوں، وہ اپنے میں سے ایک کو اپنا خرچ سپرد کر دیں، اور اس کو اپنے کاموں کا منتظم بنا دیں" کبھی فرماتے کہ "میری مثال یتیم کے منتظم اور سرپرست کی مثال ہے کہ اگر اس کو فراغت ہو تو اپنا کھائے اور اگر احتیاج ہو تو اس کے مال سے بقدر ضرورت لے لے"۔

ایک مرتبہ صدقہ کے اونٹوں کو سخت گرمی میں تارکول لگا رہے تھے، کسی شخص نے کہا کسی غلام سے فرما دیا ہوتا، فرمایا "مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہوگا"۔

فرماتے تھے کہ "اگر فرات کے کنارہ بکری کا ایک بچہ بھی مر گیا تو مجھ سے اس کا حساب ہوگا"[1]۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ وہ عام باورچی خانہ میں (جو بیت المال کی طرف سے ہوتا تھا، اور جس پر عام مسلمانوں کا حق تھا) گرم کیا ہوا پانی استعمال نہیں کرتے تھے، اور مجبوراً کبھی اس کی نوبت آ جاتی تو اس کی اجرت ادا کر دیتے، سرکاری کام کے لئے جو شمع جلتی اس کی روشنی سے ذاتی کام نہ لیتے اگر کوئی ذاتی گفتگو چھیڑ دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے اور اپنا ذاتی چراغ منگوا لیتے[2]۔

---

[1] سیرۃ عمر ابن الخطابؓ ابن جوزی ص ۱۴۰ [2] سیرۃ عمر ابن عبدالعزیزؒ (ابن الحکم) ص ۴۲

باوجود اس کے کہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے شہنشاہ تھے، اور بیک وقت قدیم بازنطینی سلطنت، ساسانی سلطنت اور جدید اسلامی سلطنت کے واحد فرمانروا تھے، ان کی معاشرت اور خرچ کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ وہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے، تو دیکھا کہ ہر ایک اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر بات کرتی ہے، انھوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو ان کی دایہ نے کہا کہ آج گھر میں مسور کی دال اور لہسن کے سوا کھانے کو کچھ نہ تھا، ان بچیوں نے یہی کھایا، اور اس خیال سے کہ آپ کو اس کی بو سے تکلیف نہ ہو، منہ پر ہاتھ رکھ کر بات کرتی ہیں، عمر بن عبد العزیزؒ یہ سن کر رونے لگے اور کہا کہ بیٹیو! اس میں تمہارا کیا فائدہ کہ تم انواع واقسام کے کھانے کھاؤ اور تمہارے باپ کو جہنم میں لے جایا جائے، یہ سن کر بچیاں رونے لگیں۔[1]

اسی طرح انسان کی شرافت اور برتری کا ایسا احساس پیدا ہوتا ہے کہ انسان جانوروں کی سطح پر اتر آنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا، اور اپنے ہم جنس انسانوں کے ساتھ جانوروں یا بے روح جمادات کا سا سلوک کرنے پر اس کا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا، وہ ان کو اپنے ذاتی تفوق اور اقتدار کے لئے غلام بنانا جائز نہیں سمجھتا اور اپنے اور اپنے بنی نوع کے درمیان کوئی ایسا فرق نہیں دیکھتا جس سے وہ ان کی تذلیل واہانت کا حقدار ہو۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ عمرو بن العاصؓ (جو مصر کے گورنر تھے) کے بیٹے نے گھوڑ دوڑ کے موقع پر ایک مصری کے کہنے پر کہ واللہ میرا گھوڑا آگے ہے، مصری کے ایک تھپڑ مارا اور کہا کہ لو ایک شریف زادہ کا یہ طمانچہ، اس نے

---

[1] سیرۃ عمر بن عبد العزیزؒ (ابن عبد الحکم) ص ۵۵

حضرت عمرؓ سے جاکر شکایت کی، حضرت عمرؓ نے فوراً عمرو بن العاص کو مع ان کے بیٹے کے طلب کیا، جب وہ آگئے تو اس مصری سے کہا کہ اس دُرّہ سے شریف زادہ کو مارو، اس نے عمرو بن العاص کے بیٹے کو اتنے دُرّے مارے کہ وہ زخموں سے چور چور ہو گئے، حضرت عمرؓ نے کہا کہ اب یہ کوڑہ عمرو بن العاص کے سر پر پھراؤ، اس لئے کہ اس لڑکے نے تم کو طمانچہ مارا وہ محض اپنے باپ کی حکومت کے گھمنڈ میں، پھر آپ نے عمرو سے کہا۔

متی استعبدتم الناس وقد	کب سے تم نے لوگوں کو غلام بنایا حالانکہ
ولدتهم امهاتهم احراراً۔[1]	وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے۔

ہمارے علم میں تمدن و تہذیب کی پوری تاریخ میں یہی ایک خالص اصولی اور اخلاقی سوسائٹی تھی، جس میں عزت و وقعت اور فضیلت کا معیار مال و دولت، منصب و وجاہت، نسب و شرافت نہیں تھا، بلکہ اخلاق، دینداری اور خدا کا خوف تھا، اس میں عزت و احترام، صدر نشینی و فوقیت، لباس اور ظاہری و فانی چیزوں کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی تھی، بلکہ سارا اعزاز و امتیاز ایمان، عمل صالح اور حسن سیرت کی بنا پر تھا۔

حضرت عمرؓ سے ملنے ایک مرتبہ قریش کے بڑے بڑے سردار آئے جن میں سُہیل بن عمرو اور ابوسفیان بھی تھے، اور کچھ آزاد شدہ غلام بھی آئے جن میں صُہیب اور بلال تھے، عبداللہ ابن عمر نکلے اور صہیب اور بلال کو اندر بلالیا، اور سرداران قریش کو چھوڑ دیا، ابوسفیان نے کہا کہ خدا کی شان ہے صہیب و بلال اندر بلائے

---

[1] سیرۃ عمر بن الخطاب ابن جوزی صہ ۸۵-۸۶

جاتے ہیں، اور ہم بیٹھے رہتے ہیں، سہیل نے کہا کہ دوستو! اگر تم کو اس بات پر غصہ آتا ہے، تو اپنے ہی اوپر یہ غصہ اتارو، اس میں ہمارا ہی قصور ہے، بلانے والے نے صلائے عام دی تھی، پکارنے والے نے سب کو پکارا تھا، ان لوگوں نے لبیک کہی، ہم بیٹھے رہ گئے، جس طرح ہم نے اس دعوت (اسلام) کو قبول کرنے میں دیر کی اسی طرح آج بھی ہم ہر موقع پر پیچھے رہیں گے، اس وقت کیا ہوگا جب قیامت میں یہ لوگ بلائے جائیں گے، اور تم پیچھے رہ جاؤ گے۔

ان لوگوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ یہ کوتاہی تو ہم سے ہوگئی، اور اس کا داغ تو ہمیشہ رہے گا، اب کسی طرح اس کی تلافی ہوسکتی ہے؟ حضرت عمرؓ نے شام کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں جاؤ اور جہاد کرو، چنانچہ یہ لوگ شام چلے گئے اور جہاد میں اپنی زندگی بسر کی۔[1]

حضرت عمرؓ نے بیت المال کی تقسیم میں بھی یہی ترتیب رکھی تھی کہ اسلام کے قبول کرنے میں اور اس کی خدمت میں جس کا جتنا حصہ تھا اسی کے مطابق اس کو بیت المال سے ملے گا۔

شام کے سفر میں جب حضرت عمرؓ سے حضرت ابو عبیدہ نے یہ کہا کہ اس وقت سب کی نگاہیں آپ کی طرف ہیں، آپ اپنا لباس کچھ درست کر لیجئے تو انھوں نے فرمایا کہ "ابو عبیدہ تمہاری زبان سے میں یہ نہ سنتا تو اچھا تھا! دنیا میں ہم سے تم سے زیادہ ذلیل، زیادہ بے وقعت اور ہم سے کم کوئی نہ تھا، اللہ نے اسلام کے ذریعہ ہم کو عزت دی، اب اللہ کے سوا اگر کسی اور ذریعہ سے تم عزت کے طالب

---

[1] سیرۃ عمر بن الخطاب ابن جوزی ص۹۵

ہو گے تو اللہ تم کو ذلیل کر دے گا"۔[۱]

حضرت عمرؓ نے انتقال کے وقت جن لوگوں کے لئے فرمایا تھا کہ ان میں اگر کوئی زندہ ہوتا تو خلافت کا اہل تھا، ان میں سے ایک سالم بھی تھے، جو حضرت ابو حذیفہ کے آزاد کئے ہوئے غلام تھے۔

بلال حبشیؓ نے اپنے بھائی کا انصار کے ایک شریف گھرانے میں پیام دیا تو اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ "میں بلال ہوں، حبشی نژاد اور آزاد شدہ غلام یہ میرا بھائی ہے، اگر اپنے خاندان میں اس کی شادی کرتے ہو تو بسم اللہ ورنہ اللہ اکبر (اللہ بہت بڑا ہے)" ہر طرف سے آواز آئی بسر و چشم ہم کو منظور ہے۔ بھائی نے کہا اس وقت اس اظہار واقعہ کی کیا ضرورت تھی؟ کہا کہ اسی راست گوئی کی بدولت تمہاری شادی ہوئی۔[۲]

حسی اور جاہلی تمدن کے خلاف اس تمدن کی بنیاد خالص عقائد، اخلاق اور اصول پر ہوتی ہے، اور ان کو مصالح اور فوائد پر قربان کرنا، کفر و ارتداد کے مرادف ہوتا ہے، اس مذہب کے پیرو اور اس تمدن کے نمائندے دنیا میں حق و انصاف کے علمبردار اور خدا کی زمین پر خدائی فوجدار ہوتے ہیں، دوستی اور دشمنی کسی موقع پر حق و انصاف کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، اور حق کے موقع پر وہ دوست اور دشمن، خویش و بیگانہ میں تفریق نہیں کرتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا	اے ایمان والو کھڑے ہو جانے والے بنو
قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ	اللہ کے واسطے گواہی دینے والے انصاف

---

[۱] البدایہ والنہایہ ابن کثیر [۲] طبقات ابن سعد۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى	کے اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف
اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ	کو ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو، یہی بات
اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا	زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے ڈرتے رہو
اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	اللہ سے اللہ کو تمہارے عمل کی خوب
(سورہ المائدہ ۸)	خبر ہے۔

ان کا اشتراک عمل اور تعاون غیر مشروط اور غیر محدود نہیں ہوتا، وہ صرف نیکی اور انصاف پر ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى	اور ایک دوسرے کی مدد کرو نیک
وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ	کام پر اور پرہیزگاری پر اور مدد نہ کرو
الْعُدْوَانِ (سورہ المائدہ ۲)	گناہ پر اور ظلم پر۔

اسی ذہنیت اور تربیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر یہ الفاظ فرمائے جس کے سننے کے وہ جاہلیت میں عادی تھے "انصر اخاك ظالما او مظلوما" تو مسلمان صبر نہ کر سکے، اور ادب بھی یہ سوال کرنے سے مانع نہ آیا کہ یا رسول اللہ! وہ مظلوم ہو تو بے شک ہم اس کی مدد کریں، مگر اگر وہ ظالم ہو تو ہم کس طرح اس کی مدد کریں؟ آپ نے فرمایا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لو، اور اس کو ظلم نہ کرنے دو۔

کسی جماعت یا فرد کی جانبداری محض حمیت جاہلیت کی بنا پر، اور حق کے خلاف خاندانی یا قومی پاسداری اور گروہ بندی کی ذہنیت (جس کا نام اسلام کی اصطلاح میں "عصبیت" ہے) ایسا خلاف اسلام فعل اور شرعی گناہ سمجھا گیا ہے کہ فقہاء اسلام اس کو شہادت

کے غیر معتبر ہونے کے بڑے اسباب میں شمار کیا ہے، اور ایسے شخص کو جو اس کی دعوت دے مردود الشہادۃ قرار دیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی جلیل القدر مجتہدانہ تصنیف کتاب الأم کی جلد ۶ میں اس پر گفتگو فرماتے ہوئے اسلام کی صحیح روح اور نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں:۔

"جو شخص گفتگو کے ذریعہ عصبیت ظاہر کرے اس کی دعوت دے اور اس پر جتھا بنائے اگرچہ جنگ کی نوبت نہ آئے تو وہ مردود الشہادت ہے، اس لئے کہ اس نے ایک ایسے فعل حرام کا ارتکاب کیا جس کی حرمت میں میرے علم میں علماء اسلام میں کوئی اختلاف نہیں، تمام لوگ اللہ کے بندے ہیں، ان میں سے کوئی اس کی بندگی سے خارج نہیں، اور ان میں محبت کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہے، جو اللہ کا سب سے زیادہ فرمانبردار اور مطیع ہو، اور اس کی اطاعت کرنے والوں میں فضیلت و ترجیح کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہے جو جماعت مسلمین کے لئے سب سے زیادہ مفید اور کارآمد ہو، جیسے خلیفہ، منصف، عالم مجتہد اور عام و خاص مسلمان کی مدد کرنے والا اس لئے کہ ان لوگوں کی طاعت اور عمل بہت سے عام مسلمانوں کی طاعت اور عمل کا ذریعہ اور سبب ہے، تو جس کی طاعت اور عمل زیادہ ہے، وہ اس سے بہتر ہے، جس کا عمل کم ہے، اللہ تعالےٰ نے لوگوں میں اسلام کے ذریعہ مساوات پیدا کر دی ہے، اور ان کو اسلام کی طرف منسوب کیا ہے، پس وہ ان کا سب سے معزز نسب ہے، پس اگر کوئی شخص کسی شخص سے محبت کرے تو اسلام کی بنا پر محبت کرے، اور اگر کوئی شخص اپنی قوم کے ساتھ خصوصی محبت رکھتا ہے،

لیکن دوسروں کے ساتھ کوئی حق تلفی اور زیادتی نہیں کرتا تو یہ صلہ رحمی ہے، عصبیت نہیں، اور ہر شخص میں کچھ قابل محبت باتیں ہوتی ہیں، اور کچھ لائق ناپسندیدگی، کسی ایسے شخص کی محبت میں جس سے تعلق ہو، ناپسندیدہ امر یہ ہے کہ اس کے ساتھ دوسروں پر زیادتی کرنے لگے، ان کے نسب میں طعن و اعتراض کرے، اور ان کے خلاف جتھابندی کرے اور نسب کی بنا پر نفرت و بغض رکھے، البتہ اگر دوسرا شخص کسی گناہ کا مرتکب ہے یا اس کی کسی زیادتی اور ظلم کی بنا پر اس کو اس سے نفرت ہے تو مضائقہ نہیں، لیکن یہ کہنا کہ میں اس سے اس لئے نفرت کرتا ہوں اور بغض رکھتا ہوں کہ وہ فلاں خاندان سے ہے، اور فلاں خاندان سے ہے، اور فلاں قوم سے ہے، یہ وہ خالص عصبیت ہے، جس سے شہادت نامقبول کر دی جائے گی، اگر کوئی شخص کہے کہ اس کی شرعی دلیل کیا ہے، تو کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ "مسلمان بالکل بھائی بھائی ہیں"، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وکونوا عباد اللہ اخوانا" اے اللہ کے بندو بھائی بھائی بن جاؤ، تو اللہ اور اس کے رسول کی خلاف ورزی کرنا اور عصبیت جیسے فعل حرام کا جس میں کوئی تاویل نہیں، اور مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، صاف صاف ارتکاب کرتے رہنا ایسا ہی جرم ہے کہ اس سے آدمی مردود الشہادۃ قرار دیا جائے۔[1]

---

[1] شہادۃ اہل العصبیہ ص ۲۱۱-۲۱۲

جماعت مسلمہ کی صحیح تعریف یہ ہے، جو قرآن نے کی ہے:۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ — ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں
بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ — ایک دوسرے کے مددگار ہیں، نیک بات
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ — سکھلاتے ہیں، بری بات سے منع کرتے
وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ — ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ
الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ — دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول
رَسُوْلَهٗ (سورہ توبہ۔۷۱) — کے حکم پر چلتے ہیں۔

اشراقی فلسفہ اور نظام کے برخلاف اس میں ترک دنیا اور ترک علائق، صحرا نشینی
ر رہبانیت کے عناصر نہیں ہیں، خودکشی خواہ وہ دفعۃً ہو یا تدریجی حرام ہے، خود آزاری
ر جسمانی تعذیب ناجائز، تجرد و ترک ازدواج غیر مستحسن فعل، صحرا نشینی اور دائمی خلوت
دینی ناپسندیدہ عمل، غیر فطری ریاضتیں اور نفس کشی عبادت و زہد میں بے اعتدالی سب
لاف تعلیمات ہیں، اوپر یہ آیت گزر چکی ہے:۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ — کہو کس نے اللہ کی وہ زینت جو اس نے
لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ — اپنے بندوں کے لئے پیدا کی اور کھانے
(سورہ اعراف۔۳۲) — پینے کی پاک صاف چیزیں حرام کیں۔
وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (اعراف ۳۱) — کھاؤ پیو اور اسراف سے بچو۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ۔ — اسلام میں رہبانیت نہیں۔

لَا صَرُوْرَةَ فِي الْاِسْلَامِ۔ — اسلام میں تجرد نہیں۔

اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ وَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ ط

نکاح میری سنت ہے اور جو میری سنت سے اجتناب کرے اس کا مجھ سے تعلق نہیں

آپ نے حضرت عبداللہ بن عمرو کو جو مسلسل روزہ رکھتے تھے اور رات بھر نمازیں پڑھتے تھے، یہ نصیحت فرمائی۔

فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا صُمْ وَاَفْطِرْ

تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کسی دن روزہ رکھو کسی دن نہ رکھو۔

مسلمانوں کی دعا یہ ہوتی ہے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (سورہ البقرہ۔۲۰۱)

اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی اور ہم کو جہنم کی آگ سے بچا۔

یہاں مردانگی کسی غار میں بیٹھ کر اللہ کو یاد کرنا نہیں، بلکہ زندگی کی کشاکش، بازاروں کے شوروغوغا اور کاروبار کی مصروفیت میں خدا کو نہ بھولنا جوانمردی ہے:۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ (سورہ النور۔۳۷)

وہ جوانمرد جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور نماز کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں، جس میں دل اور نگاہیں پلٹ جائیں گی۔

یہاں صرف خدا کی یاد اور اس کی عبادت پر اکتفا نہیں بلکہ نماز کے بعد کسب معاش

حصول رزق اور محنت و تجارت کی بھی ترغیب ہے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلوٰةُ فَانْتَشِرُوْا	جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل
فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ	جاؤ، اور اللہ کے فضل کی تلاش
اللّٰهِ (سورہ الجمعۃ:۱۰)	کرو۔

عقلی تمدن کے برخلاف اس میں اخلاق اجتماع کے بارہ میں چند ثابت شدہ اور مسلم حقائق اخلاق کی چند غیر متزلزل بنیادیں اور خیر و شر کے کچھ دائمی معیار ہیں، جس میں کسی عقلی ترقی یا تنزل یا تغیر سے کوئی فرق نہیں ہوگا، جو چیز بُری ہے، وہ قیامت تک بُری رہے گی اور جو چیز اچھی ہے، وہ ہر زمانہ میں اچھی رہے گی، شرم و حیا، تہذیب و اخلاق، وفاداری، معاہدہ کی پابندی، سچائی امانت داری، عفت و عصمت ہر دور اور ہر قسم کے حالات میں مستحسن، قابل تعریف اور ضروری اوصاف و اخلاق رہیں گے، اور ان کی حقیقت اور ان کے اعتبار میں کوئی تغیر نہ ہوگا، اس کے مقابلہ میں ان کے مقابل اوصاف ہر جگہ اور ہر زمانہ میں مذموم اور ناپسندیدہ صفات سمجھے جائیں گے، خواہ عقل ان میں کسی قدر مصالح و منافع دکھائے، اور ان کے جائز اور بعض اوقات فرض ہونے کا فتویٰ دے، اخلاق کا معیار انسان کا ذوق و وجدان یا اس کی تعریف و اصطلاح یا اس کا تجربہ یا اس کی عقل نہیں ہوگی کہ ان میں سے ہر چیز بدل جانے والی ہے، اور بہت سی چیزوں سے متاثر ہونے والی ہے، یہاں خیر و شر کا معیار خود ان اشیاء کی فطرت ہے، جس کی وضاحت کرنے والی اور پھر اس کی حفاظت کرنے والی وحی و رسالت ہے

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا	اللہ کی بنائی ہوئی فطرت جس پر اس نے
لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ	لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کے بنائے ہوئے کو کوئی
الْقَیِّمُ (سورہ الروم۔۳۰)	بدل نہیں سکتا یہی سیدھا اور استوار دین ہے۔

عقلی تمدن و فلسفہ کے دور میں اکثر قوم اور سوسائٹی پر سوفسطائیت طاری ہو جاتی ہے، حقائق اشیاء کا اور اخلاق و صفات کے باہمی فرق کا انکار کیا جانے لگتا ہے، خیر و شر کے قدیم معیاروں اور ان کی تعریفوں میں شک کیا جانے لگتا ہے، اخلاق و صفات، حسن و قبح محض اعتباری اور نسبی شئے سمجھی جانے لگتی ہے، جو زمان و مکان کے اختلاف سے بدلتی رہتی ہے، یہ ذہنی کیفیت سخت اخلاقی انحلال اور اجتماعی اختلال پیدا کر دیتی ہے، اور جب کسی قوم کی زندگی میں یہ دور آجاتا ہے تو پھر اس کو تباہی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

یونان قدیم میں اس کی قومی بربادی کے وقت یہی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، ایران قدیم میں اس نے اباحیت (ہر چیز کو جائز سمجھنا) کا رنگ اختیار کر لیا تھا، اور پورا نظام تمدن و معاشرت زیر و زبر کر دیا، روم کے مورخین اسی کا شکوہ کرتے ہیں، اور آج یورپ میں بعینہٖ یہی کیفیت موجود ہے، اور وہاں مفکرین اور اصلاح پسند اشخاص عرصہ سے سخت خطرہ محسوس کر رہے تھے، مگر اس کا علاج کسی کے پاس کچھ نہیں، اس کی روک تھام صرف نبوت کی تعلیمات اور محفوظ مذاہب کر سکتے ہیں، جو اخلاق کا فیصلہ اور حسن و قبح کا معیار عقل یا تجربہ پر نہیں چھوڑتے، بلکہ ان کو خود طے کر کے دیتے ہیں، اور ان کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔

اس طرح یہ تمدن پورے طور پر مسخ ہونے سے محفوظ رہتا ہے' اور ان کی اِن خرابیوں کی اصلاح کا (جو باہر سے اس میں داخل ہو جاتی ہیں) موقع رہتا ہے' اور اس کی تجدید ممکن ہوتی ہے۔

اس موقع پر یہ ممکن نہیں کہ اسلامی تمدن کے پورے خط و خال اور اس کی پوری خصوصیات پیش کر دی جائیں' اس کے لئے کتابیں بھی ناکافی ہوں گی یہاں پر صرف اس کی روح اور اس کا خاص مزاج پیش کرنا تھا، اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ عرض کیا اُس سے آپ اس کی اسپرٹ سمجھ گئے ہوں گے، اور سابق الذکر تہذیبوں اور اس الہامی تہذیب کے درمیان جو اصولی اور جوہری فرق ہے' وہ آپ کے سامنے آگیا ہوگا۔

اب آخر میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ کے نزدیک مادی تمدن قابلِ ترجیح ہے' اور اس کے نتائج انسانیت اور اخلاق کے حق میں زیادہ مفید ہیں تو پھر مجھے آپ سے کچھ کہنا نہیں' اس لئے کہ یہ خوش قسمت تمدن زمین کے سب سے بڑے رقبہ پر حکمران ہے' اور باوجود اس کے کہ وہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد (غالباً سب سے بڑی تعداد) کے لئے مقناطیس کی کشش رکھتا ہے، پھر بھی اس کے لئے یا اس میں کسی جزئی ترمیم کے لئے یا اس کو زیادہ تیز کرنے کے لئے اس وقت بڑی جدوجہد برپا ہے، اس کے لئے قومیں کی قومیں قربانیاں پیش کر رہی ہیں: اس لئے اس کی خاطر آپ کو کسی خاص جدوجہد یا قربانی کی ضرورت نہیں' یہ ایک مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا سمندر اور ایک بہتا ہوا دھارا ہے، آپ کا کام صرف یہ ہے کہ

آپ اپنے کو اس کے حوالہ کر دیں۔

لیکن اگر آپ کا انتخاب اس کے برعکس ہے تو پھر اس کے لئے آپ کو سخت جدوجہد کرنی پڑے گی، آپ کو دریا کے رُخ کے خلاف پیرنا پڑے گا، بلکہ دریا کا رخ پھیرنا ہوگا، آپ کو خود اپنی ان خواہشات، افکار وخیالات اور رسوم و عادات کی سب سے پہلے قربانی کرنی پڑے گی، جو صدیوں سے حسی و مادی تمدن و تہذیب اور نظام حیات میں رہنے کی وجہ سے آپ کی زندگی کا جز بن گئی ہیں، آپ کو اس عظیم الشان مقصد کے مقابلے میں دوسرے فروتر مقاصدِ زندگی کو خیرباد کہنا ہوگا، آپ کو اپنا پورا نظام تعلیم و تربیت اس مقصد کا تابع اور اس کا ہم آہنگ بنانا ہوگا، اور اس میں جتنے اجزا، اس سے موافقت نہیں رکھتے یا اس سے متصادم ہیں، ان کو حذف کرنا ہوگا۔

یہ کام دنیا کا سب سے بڑا کام ہے، اور اس کی ذمہ داری تنہا آپ کے سر ہے، زندگی کے جتنے نقشے دوسروں کے پاس تھے، وہ ان کو بار بار آزما چکے اور ناکام ہو چکے، اب صرف آپ کا نقشہ باقی ہے، جو صرف ایک بار آزمایا گیا تھا، اور پورے طور پر کامیاب ثابت ہوا تھا، دنیا کی بوسیدہ اور متزلزل عمارت اب پھر آپ کی تعمیر نو کی منتظر ہے۔

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر الٰہی اس کام کا فیصلہ کر چکی ہے، اللہ کو اپنی

اس زمین کی بربادی ہمیشہ کے لئے منظور نہیں، اگر یہ کام آپ سے نہ ہو سکے گا تو دوسروں کے ہاتھوں ہو گا۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ۔

(سورہ محمد ۳۸)
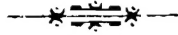
مفکرِ اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

کی چند اہم شاہکار تصنیفات

تاریخ دعوت و عزیمت مکمل (پانچ حصے)
مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ
تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات
تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں
جب ایمان کی بہار آئی
مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت
حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب
عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح
تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک
مطالعۂ قرآن کے مبادی اصول
سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ
خواتین اور دین کی خدمت
کاروانِ ایمان و عزیمت
سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ

نبی رحمتؐ مکمل (دو حصے)
حدیث کا بنیادی کردار
معرکۂ ایمان و مادیت
پرانے چراغ (تین حصے)
ارکان اربعہ
نقوشِ اقبال
کاروانِ مدینہ
قادیانیت
تعمیر انسانیت
حدیث پاکستان
اصلاحیات
صحبتے با اہل دل
کاروانِ زندگی (سات حصے)
مذہب و تمدن
دستورِ حیات
حیات عبدالحئیؒ
دو متضاد تصویریں
تحفۂ پاکستان
پاجا سراغ زندگی
عالم عربی کا المیہ

ناشر، فضلِ ربّی ندوی ــــ فون 6600896 - 6601817

مجلس نشریاتِ اسلام ناظم آباد مینشن۔ ا۔کے۔۳۔ناظم آباد ۱، کراچی

اسٹاکسٹ: مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر، اردو بازار، کراچی

فون - 2638917

IDARA-E-TABA'AT: 6609167